

UrduPhoto.com

مستنصر حسین تارڑ

خس و خاشاک زمانے

© OneUrdu.com

# خس و خاشاک زمانے

ناول



نگ میل پبلی کیشنز، لاہور

© OneUrdu.com

عطار کے پرندوں اور نئے آدم کے نام

UrduPhoto.com

© OneUrdu.com





گھٹکھڑیا لے پٹے سفید بال اُس کی میز می گردن کی مُردہ ہو چکی رگوں اور شریانوں کو ڈھاپتے تھے۔ ناک اتنی تنگی تھی کہ وہ اتنی تنگی ہونے سے نکل آ کر قدرے ترچھی ہوئی جاتی تھی۔ اُس منتظر بوڑھے کا پنڈا ایسا تھا کہ اُس پر پانی ٹھہرنا نہ تھا اتنا چکنا اور پھسلواں۔ بھوری بھینسوں کے مکھن اور دودھ سے پلا ہوا پنڈا۔ اُس پر اتنی چکنائیت کہ پانی اُس پر ٹھہر ہی نہ سکتا تھا۔ ایسا بدن بخت جہان کا تھا جو چوکھٹ کے پار کھڑا اُس کی مرگ کا منتظر تھا۔ اُس کی گردن ہمیشہ کے لیے ڈھلک جانے کے انتظار میں کھڑا تھا۔

اگرچہ اُس کی بخت جہان کی اپنی اکڑی ہوئی گردن بھی بار بار ڈھلکتی تھی۔  
اگر شام تک صاحب بہادر مرغ کی گردن نہ ڈھلکتی تھی قائم رہتی تھی تو بخت جہان نے اپنی حویلی کے کھنڈر میں۔ اُن گھوڑوں کے اصطبل میں جن کی نعلیں بھی زنگ آلود ہو چکی تھیں اور پچھلے پیار کے مسمار ہونے کو دردِ یوار کی تاریکی میں بکھرے ہوئے ”جب دل ہی ٹوٹ گیا“ ”بد سوزے“ اور ”بدرِ یارس گئی اُس پار“ کے گھس چکے سیاہ ریکارڈوں میں۔ ایک تقریباً بھوکے رات گزارنی تھی۔ کثیر فاصلے پر کچھ باغیکہ تانگے کی گزراؤ کی سکت تھی پر وہ۔ بخت جہان تو کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا سکتا تھا۔ البتہ اپنے سبکدوشی محمد جہان کی بیٹی نور بیگم کی مری ہوئی مرغیوں پر غصے کا حق بناتا تھا۔ اپنوں سے مانگنے میں تو کوئی عار نہ تھا۔

صاحب بہادر بمشکل قائم چوکھٹ کے پار اپنی زرد آنکھوں سے اُس شخص کو دیکھتا تھا جو اُس کے مسمار ہو جانے کا تمنائی تھا۔ کہ وہ دُور سے آئے اور وہ نور بیگم سے ملتا تھا۔ اُس شخص کی آخری بیٹی ہو تو ہمیشہ کی مانند اُس کے چاچا کا گناہی لادو گردن ایک مراد مرغ زور سے پر۔ اُس لکڑی سے ڈھیر پر چڑھنے کی بجائے مجھے عنایت کر دو۔

اور نور بیگم کیا سب سے پچھلی اندھیاری کوٹھڑی میں جہاں اُس نے روشن کو جنم دیا تھا جہاں رائے پایوں کی نواری چار پائیاں ایک کے اوپر ایک پر تلے تھیں جیسے شہتیروں کے درمیان دوئی کا جو وزن لگ تھا اُس تک جاتی تھیں اور اُن میں وہ نواری چار پائی بھی تھی جس پر اُس کی بہن ماں بہشت بی بی نے آخری سانس لیے تھے تو نور بیگم اُس چار پائی پر لیٹی اُس کی نواریں سے بھٹی اپنی ماں کے بدن کی خوشبو سانسوں میں بھرتی اپنی دل کش آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرتی تھی اور جس لمحے وہ چوکھٹ کے پار گئی میں آکھڑا ہوتا ہے اپنی نیلی اور بھوکے آنکھوں سے دبیز بے کے اندر جھانکتا ہے تو نور بیگم کو گویا الہام ہو جاتا ہے کہ وہ ایک تلے ابھی تک اپنی ناگوں پر کھڑا اُس کا اکلوتا اور چیتا مُرغ جس کا دم لٹکا ہی چاہتا ہے اور وہ پچھلی کوٹھڑی میں اپنی ماں کے پاس اسی لیے آ لی تھی کہ وہ اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی تو اُس پر چاہا بخت جہان اس لمحے اُس پر نظر میں جمائے ہوئے ہے تو وہ اپنے باریک ہونٹ چینی ہار و بیڑے میں آ کر چوکھٹ تمام کر کہتی ہے ”چاچا“ دفع ہو جا یہاں سے۔ یہ صاحب بہادر نہیں مرنے والا۔ مر بھی گیا تو تجھے نہیں ملے گا۔ میں بھی محمد جہان نمبردار کی بیٹی ہوں زور می پر چھینک دوں گی۔ چوڑی کودے دوں گی پر تجھے نہیں دوں گی۔ چلا جا یہاں سے۔“

اس نور بیگم کے شوق نرالے تھے۔

اُس پاس کے گاؤں سے دُور دراز سے سوہنی سوہنی باگی چھیلی مرغیاں منگواتی۔ اُن کے اندوں کو بھوسا بھرے

گھٹک میں اپنے ہاتھوں سے سجاتی اور کسی کڑکڑ کرتی مرنی کو ان پر ہنسا کر چوزوں کے نکلنے کا انتظار کرنے لگتی۔ راتوں کو اٹھ کر ان پر چٹھی مرنی کے پروں تلے جھانکتی کہ کیا کوئی ایک ایسا انڈہ ہے جو ترخ چکا ہے اور اس میں سے کسی چوزے کی جھجک جھانکتی ہے۔ اور جب پہلا چوزہ انڈے کے چھلکے میں سے برآمد ہوتا تو وہ اُسے اپنے پہلے جائے روشن کی مانند ہی پیارا لگتا۔ میزے کے اوپر رستوں کا ایک جال تاق تھا تاکہ ہمیشہ کی منتظر چلیں جھپٹ کر کسی چوزے کو دبوچ نہ لے جائیں۔ وہ ان مرنیوں کے عشق میں ایسی جتا تھی کہ ہر مرنی کو انفرادی طور پر اس سے مخاطب ہو کر اس سے گفتگو کرتی تھی۔ اس کا حال جال پر چھتی اور اس سے لاڈ پیاری باتیں کرتی تھی یہاں تک کہ پچھلی کوٹھڑی میں لیٹے ہوئے اگر اُسے کسی مرنی کی گلو گلو سنائی دیتی تو وہ اُس کی شناخت کر لیتی کہ یہ تو فلاں چٹکھری ہے اور اُسے شاید پیاس لگی ہے۔

دنیا پور والے خاص طور پر جو شریک تھے وہ اُسے تسخر کے انداز میں مرنیوں کی ماں کہتے۔ اور اُسے اس لقب سے کچھ ملال نہ ہوتا بلکہ فخر مند ہوتی کہ اگر ایک بلیوں کا باپ یعنی ابو ہریرہ ہو سکتا ہے تو وہ بھی مرنیوں کی ماں ہو سکتی تھی۔

ایک روز میز پر چٹنے جال کے نیچے رکھتے چوزوں اور مرنیوں پر لپکنے والی ایک چیل اُس جال میں پھنس کر پھنسے چوزہ تک پہنچنا فریاد کرتی رہی اور پھر مردہ ہو کر لٹک گئی تو گویا نورینیم کی بیماری راج ڈال دی مرنیاں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ اُس مردہ چیل کو دیکھ کر بقیہ چیلوں نے وہ آسان خالی کر دیا جس کے نیچے نورینیم کا چوزہ اور مرنیوں سے بھرا ہوا آگے آگے لٹکا ہوا تھا۔ ان کی باتیں سن کر ان کی بیماری کی خبر سن کر ان کی مرنیاں بیکدم نشست اور سسکتی ہوئی گئیں خوراک پر چونک کر نہ مارتیں اور پانی پیتی رہیں ان کے بخار زدہ بدنوں کی پیاس نہ بھٹتی۔ اُسے رالیں پینے لگیں۔ ان کی ہیٹ پٹی اور سبز رنگ کی ہوئی جیسے انتڑیوں کی بیماری میں جتا سال چھوڑنے کے بچوں کا پاجاما ہوتا ہے۔ اور وہ سب کی سب میزے میں چٹنے اور گڑا گڑانے کی بجائے سراپہ گمی کی حالت میں ایک کونے میں اکٹھی ہوئے لگتیں۔ اس رانی کھیت بیماری کا کوئی پانچواں دن تھا۔ ان کی بیماری کا علاج نہ ہوئے تھے جو انہیں کسی حد تک موت سے محفوظ کر لیتے۔

جب پہلی مرنی صحن میں ڈھیر ہوئی تو نورینیم اُسے اپنی آغوش میں لے کر در تک بھلاتی رہی کہ شاید یہ بے ہوش ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔ ہر مرنی کی موت کے ساتھ نورینیم بھی تھوڑی سی مرجاتی۔

بیسر عام تو نہیں پر اندر ہی اندر وہ ہر مرنی کی موت پر ماتم کرتی۔ ڈھیروں آنسو بہاتی یہاں تک کہ پودہ ماگھ کی راتوں میں اُس کی رضائی گیلی ہو جاتی اور وہ اُس کی گیلیا ہٹ میں لیٹی سردی سے ٹھٹھرنے لگتی۔ ایک ایک کر کے سب مرنیاں ہر مرنی رخصت ہوتے گئے۔

اور جب وہ پہلی مرنی جو نورینیم کے اپنی آغوش میں بھلانے سے بھی زندہ نہ ہوئی تو وہ انگھار آنکھوں سے اُسے پیٹنے سے لگے کوڑے کرکٹ کی ڈھیری ایک رُوڑھی پر پھینکنے کے لیے جاری تھی تب چاچے بخت جہان کی پکار نے اُس کا پیچھا کیا تھا۔ گویا اُسے رُوڑھی پر مت پھینک میں نے اسے مرتے ہوئے دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا تھا یہ طلال ہے۔ اُسے مجھے

چاچے نے اب جانے کونسا کلمہ پڑھ لیا تھا پر نور بیگم نے وہ پہلی مردہ مرغی اُس کے حوالے کر دی کہ اُس کے اندر حوصلہ نہ تھا کہ وہ اپنی لاڈلی کو یوں کوزے کے ڈھیر پر پھینک دیتی۔

چاچے کی تو ہر روز عید ہو گئی۔ ایسی موج ہو گئی کہ وہ ہر روز کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین چار مرغیاں مری ہوئی بھون کر کھاتا تھا اور پھر پہلے سے بھی کہیں پاٹ دار آواز میں گلی میں سے گزرنے والوں اور چھت پر سے گود کرانگے کوٹھوں تک ستر کرنے والوں کو خوب گالیاں دیتا۔ اوائے گودی یا ہو یو۔

نور بیگم کے سونے ہو چکے صحن میں دھڑیک کے زرد پتوں کا فرش بچھا تھا اور صاحب بہادر مرغا کے زرد پنچے اُس میں یوں مدغم ہوتے تھے کہ پہچان نہ ہوتی تھی کہ وہ دھڑیک کے پتے ہیں یا اُس کے پنچے ہیں۔ وہ ابھی تک اگرچہ قدرے مشکل اور جانفشانی سے اپنی ناگوں پر قائم تھا اور بخت جہان اُس پر نظریں جمائے منتظر تھا۔

”تو کیسی میری سنگی بھتیجی ہے نہ وہ کلمہ پڑھتا ہے ابھی صاحب بہادر مرغا نے اُترنا ہی ہے۔ یہ مر جائے گا تو اپنے گئے چاچے کو نہیں دے گی۔ کون سے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک آئے گی۔“

”ہاں بھتیجے نہیں دوں گی۔ زور دھی پر پھینک آؤں گی۔“

تو میں اسے وہاں سے اٹھالوں گا پھر۔۔ میں نے ابھی ابھی کلمہ پڑھ کر اس پر چھوٹک دیا ہے۔ یہ حلال ہو گیا ہے۔ یہ صاحب بہادر مرغا نے اس کے گوشت میں دھڑیک سے اُتر کر اُس کے گود کرانے کی بھٹیوں کو طاقت دے گی۔ نور بیگم نے چاچے کے چاچے کا چاچہ لایا تھا۔

”جی جی جی۔ تو نے کبھی لایا کیا تھا؟“

”نہیں لایا تھا دھڑیک۔ میں کوئی افکار کرتا ہوں۔ تو خود چینی ہے۔ چانتی ہے کہ جیمہ جاٹ ڈاکٹر درے اپنی خصلت اور تکبر سے مجبور ہوئے ہیں۔ اگر میں نے لایا نہیں کیا تو میں بھی مجبور قتل ہو کر میری گردن کوئی جماندرو میز می تو نہ تھی۔“

ہولے ہولے اس تکبر کی مجبوری نے اُسے ایسا جامد اور میض بنا کر دیا کہ میں اُسے اب حرکت نہیں دے سکتا۔ موٹی ہوئی مرغیوں کے لیے مشقت مہاجت کرنے والا شخص محض اپنے جاٹ ہونے کے تکبر کی وجہ سے بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔“

”چاچا جیمہ راجشتی باپ“ تیرا بھرا محمد جہان بھی تو ایک جیمہ جاٹ تھا۔ اُس میں درویشی، متانت اور قناعت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور تو نے میرے نمبردار باپ کی درویشی کی کمائی کھائی۔ اُسی نے تجھ سے لاڈ پیار کر کے پکاڑا۔ تو نے کبھی ایک تنکا تو ڈکھری دوہرا کیا تھا؟ ڈانگ تمام کر۔۔ برچی اشکا کر اپنے سکھ یاروں کے ساتھ موجیں کرتا دندناتا پھرتا تھا۔ میرے راجشتی باپ کی وجہ سے۔ اور پھر تم نے اُس کی آل اولاد کے ساتھ کیا سلوک کیا چاچا۔“

صاحب بہادر میں سکت کم ہوتی جاتی تھی وہ کوشش کر رہا تھا کہ اُس حریص بوڑھے کی پڑ مردہ آنکھوں کے سامنے ڈھیر نہ ہو۔ اُسے چاہنے والی چوکت پر ہاتھ رکھے اُسے اُس بوڑھے کی منتظر نظروں سے بچانی طیش میں تھی۔

”جو ہوا سو ہوا نور بیگم۔ کیوں گڑھے مردے اُکھیرتی ہے۔ ایک مرنے والے مرغا کے لیے اپنے گئے چاچے کو یوں بے عزت کرتی ہے۔ رُسوا کرتی ہے۔“







کی مہک نے اُسے ایسا غماز عطا کیا کہ وہ تھوہری کی زہرنا کی بھول گئی.. وہ اپنے رب کی اتنی شکر گزار تھی کہ اُسے روشن بخش ایسا بیٹا نصیب ہوا کہ اُس نے اس چاہے کے گناہوں کو بھی درگزر کر دیا.. البتہ زینب بیگم اسے نظر انداز نہ کر سکی.. وہ چاہے کی زیادتیوں پر ہر رات روتی.. وہ کیسے ایک ایسے شخص کو حاف کر سکتی تھی جس نے صرف دھمکی نہیں دی تھی بلکہ سچ سچ اگر اُس کا بس چلتا تو اُسے مہاراجہ پنپالہ کے آگے بچھ دینا تھا.. وہ ہر رات روتی اور یہ طے کر لیتی کہ اگلی سویر وہ اُس بوڑھے کو جب وہ افیون کی خود فراموشی میں تھکے گزر گزرا رہا ہوگا اُس کی میز چھی گردن و بوجھ کر سیدھی کر دے گی.. اُسے مار ڈالے گی.. لیکن نور بیگم اگر آج طیش میں تھی اپنے دھیسے پن کو ترک کر کے چاہے کو اُس کی زیادتیاں اور ظلم یاد دلا رہی تھی تو اس کا سبب صرف صاحب بہادر تھا جو اُسے اپنے آٹھ برس کے روشن کی طرح ہی عزیز تھا.. بیٹوں کی طرح.. اور بیٹوں کے لیے مائیں حواس کھو بیٹھتی ہیں.. لحاظ نہیں کر سکتیں خاص طور پر اگر چوکھٹ کے پار ایک میز چھی گردن والا بوڑھا اپنی گدلی ہو چکی نیلی آنکھوں میں ایک ایسے بیٹے کے مرجانے کی ہوس اور چاہت میں منتظر ہو..

”کچھ تو لحاظ کر دیجئے..“

”چاہا تو نے کبھی لحاظ کیا تھا جواب میں کروں؟“

”کتی بار کہوں کہ ہاں نہیں کیا تھا.. اگر کرتا تو آج یہ کہتا کہ اگر تو اس مرغ کو مرنے سے روک دیتی تو میں آج بھی اُٹھلاؤں گا..“

آئے گی تو میں سے وہاں سے بھی اُٹھلاؤں گا..“

UrduPhoto.com

”مجھے تھوڑی دیر میں اس نے مرجانا ہے.. میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کی ٹانگوں میں لرزش آئی ہے اور بار بار ہنسر

رنگ کی تپشیں کر رہا ہے..“

”دفع ہو جا چاہا..“

”سُن کڑیئے..“ بخت جہان میں دیکھو.. کوئی نہ کوئی ایک حد ہوتی ہے برداشت کی.. وہ اُجڑ

کر رہے حیثیت ہو چکا تھا.. فلک بدل گیا تھا پر وہ بخت جہان بولہ بولہ موجود میں ایک مرتے ہوئے مرغ کا تمنا کی تھا وہ خود اور

اُس کی خصلت تو نہ بدلی تھی ”گلی میں کھڑا ہوں.. اپنے محلہ مغربی میں.. اس چوکھٹ کے باہر گلی میں کھڑا ہوں تیرے

ویزرے میں تو نہیں کھڑا ہوں رعب داب ہمارا ہی ہے.. میں کڑیئے..“ پر اس عزت نفس کا اہال فوراً ہی جھاگ کی مانند بیٹھ

گیا ”تو میری سگی بھتیجی ہے.. کہتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں..“

نور بیگم کا طیش بھی ٹھنڈا ہونے لگا.. وہ کوئی فیروزہ تھا اُس کا.. سگا چاہا اُس کا اپنا خون تھا.. اس سے انکار نہ

ہو سکتا تھا..

”چلا جاتا ہوں.. پر افیون کے لیے تو دو چار آنے دے دو.. چل اسے زکوٰۃ ہی سمجھ لے.. ثواب کمالے.. تجھے

بہت بھاگ گئے ہیں تجھے امیر بخش ایسا گھروالا مل گیا ہے.. روشن جیسا بیٹا مل گیا ہے.. شہر لاہور میں ٹھانڈے سے رہتی ہو تو اپنی

نیک کمائی میں سے اپنے سگے چاہے کے لیے کچھ زکوٰۃ ہی نکال دے..“ بخت جہان نے اپنی میز چھی گردن کو ایک جھٹکا سا

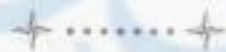
دے کر سیدھا کرنے کی کوشش کی.. وہ جانتا تھا کہ وہ ذات کی عیسق ترین گہرائیوں میں گر چکا ہے.. اپنی سگی بھتیجی سے خیرات کا

عجب بھر ہے اُس کی ملبی آنکھوں کے دُھندلکے میں ٹھہرے ہوئے کچھ آنسو اُنڈ کر اُس کے گورے تھندے رخساروں پر  
جسے گئے ستواں ناک کے اندرون سے خرخر کرتی سسکیاں باہر آنے لگیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا "آج میرا بھرا  
تھم جہان قیصر دار ہوتا تو وہ مجھ سے لاڈ پیار کرتا.. میں یوں ایک مرے ہوئے مُرخ کی بھیک اور زکوٰۃ کا طلب گار نہ ہوتا..  
جنگ میں نے اُس کی آلِ اولاد سے بُرا کیا پروہ تو مجھ سے بُرا نہ کرتا.. میں اُس کا چھوٹا بھائی تھا.. بھائیوں کے بغیر جوڑیاں  
نہیں ہوتیں.. وہ چلا گیا تو جوڑی ٹوٹ گئی.." بخت جہان کی بچگی بندھ گئی اور وہ کچھ دیر کے لیے صاحب بہادر کو بھول گیا..

اُدھر نور بیگم کا چوکھٹ پر رکھا ہاتھ لرز نے لگا.. وہ نہ صرف اپنے لاڈلے صاحب بہادر کی قریب المرگی کو فراموش  
کر گئی بلکہ اپنے چاچے کے سارے ستم بھی بھول گئی اور اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں.. وہ اپنے مرچکے  
باپ کی آخری نشانی.. اپنے گئے چاچے بخت جہان سے چوکھٹ کے پار آ کر گئی میں لپٹ گئی ہچکیاں بھرتی گویا اپنے باپ  
کے گئے لگ گئی.. وہ دونوں گئے.. چاچا اور بختی گلی میں ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے دیر تک نہایت خشوع و خضوع سے  
رہتے دھوتے رہے اور بالآخر نور بیگم اپنے آنسوؤں سے چھوٹتی ہوئی نپا پتا تو بے شک صاحب بہادر کو ابھی زندہ حالت  
میں لے چلا.. اسے حلال کر کے کھا لے.. مجھے کچھ اعتراض نہیں.."

"نہ پھر.. میرے اس موہنے مُرخ کو شالاشی ہوا نہ لگے.. یہ سدا جیوے.. پر بے ہونی ہو کر رہتی ہے اور اس کی  
جھونکاں اُٹھک جاتی ہے تو بس اسے کوڑے کے ڈھیر پر مت پھینکنا.. مجھے پکار لینا میں آ کر لے جاؤں گا.."  
"کھائے گا؟" نور بیگم نے آنکھوں میں پھنسی لگ گئی.. "اُس سے کئی روز پہلے صاحب بہادر نے کہا.. مویا ہوا مُرخ  
کھائے گا؟"

"آج بھئی.. تو ابھی ہالڑی ہے ابھی مُت دینے جوگی ہے تجھے نہیں پتا کہ موئے ہوئے مُرخ اور بندے میں کچھ  
فرق نہیں ہوتا.. سارے بندے موئے ہوئے ہیں پھر بھی جیتے ہیں.. بے شک کسی مرچکے مُرخ کو زندہ بندے کا گوشت بھون کر  
کھاوان میں کچھ فرق نہیں ہوتا.. میں سمجھتی تھی کہ وہ تو بے ہونی ہوئی ہوگی مریاں اپنے چوہے پر چڑھائی ہیں پر  
حرام ہے کہ اُن میں حلال نہ ہونے سے سوا میں کچھ فرق آیا ہو.. میں بُرا ہوں پر اتنا بُرا نہیں کہ تمہارے محبوب مُرخ صاحب  
کے کو زندہ حالت میں لے جاؤں.. مجھے اس چوکھٹ کے باہر کھڑا رہنے دے.. میں انتظار کر سکتا ہوں.. اگر اُفیون کے  
چار آنے دے دے تو مجھے تسلی ہو جائے گی.. میں تیرا کا چاچا ہوں نور بیگم.."



خواہ صورت لوگوں کی سرزمین

صاحب بہادر مرغ نے مرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

وہ اپنی ذہن نشینی کے سبب کبھی ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ اُس کے موت کی زردی میں ڈوبے بچوں پر دھڑک

کے ذریعے سرسرااتے۔

بخت جہان کب کا بول ہو کر چاچا تھا۔ اس گدڑی یا ہوس نے آج نہیں مرنا دیکھیں نے خواہ خواہ جذبات میں جھجک کر نور بیگم کی پیشکش قبول نہ کی ورنہ اب تک امیرت کورا سے بانڈی میں ٹھون رہی ہوتی۔ وہ اسے اب آواز دے کر بلانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ نور بیگم جھجکے سے میں اسے زندہ حالت میں ہی لے جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ مایوس ہو کر کتے کا چاچا تھا۔

نویسنہ: محمد رفیع رحمانی  
 فیضی اپنے آخری مہرچ کو دہشتی کہہ کر اب لڑا کر اپنا وہ نہ کرتا تھا۔ شائد وہ دہشتی ضد میں آ گیا تھا کہ میں اُس فیضی گروں والے ہوں۔ ہر کی ماڈی میں نہیں چڑھوں گا۔ نہیں مروں گا۔

چائی میں کڑکڑاتے دودھ کے اوپر تھوڑی ہو جانے والی بالائی کی موٹی تہہ کو نورنگہ نامے انگلیوں سے چھپوا اور پھر چائی کو ایلوں سے اُتار لیا۔

صاحب بہاور جوں کا توں کھڑا تھا۔ گویا وہ بھی ایک بخت جہاں ہو گیا تھا۔ اڑیل اٹھا ہو گیا تھا کہ موت کے سامنے بھی اڑ گیا تھا کہ نہیں مرنا اور عین ممکن تھا کہ وہ دل ہی دل میں اپنی آنکھوں میں اُترتی موت کو گالیاں دے کر اسے بھی

اُس سے اب یہ اذیت سہی نہ جاتی تھی۔ اُس کی موت کا انتظار کیا نہ جاتا تھا اور بیکم نے اپنے صاحب بہادر کو

یہ اٹھایا احتیاط اور الفت سے جیسے ایک بیمار بچے کو اٹھاتے ہیں اور میٹرے سے نکل گئی۔

حاجا ابنی ذھے پچی حو ملی کے محسن میں بان کی اکب بوسندہ جار بائی ربیوں اکڑا اڑا تھا جسے مرد کا ہو۔ المیتے ٹھے کی

مال اُس کے اب بھی خوبصورت ترشے ہوئے ہونٹوں میں دبی تھی اور ایک طویل وقفے کے بعد اُس کے گورے چٹے پر مردہ خسار پھیلنے لگے تھے کے پانیوں میں سے بڑا ہٹ سنائی دیتی اور پھر اُس کے منتھوں سے خارج ہونے والا دھواں گواہی دیتا کہ وہ مرنا نہیں۔

— 22 —



”اے کون اے ٹلوی یا ہوا!“ بخت جہان یکدم ہڑا کر اٹھا، ٹھکی نال اُس کے ہونٹوں سے جُدا کر زمین پر گر گئی اور پھر اُس نے اپنے سامنے نور بیگم کو صاحب بہادر کو آغوش میں لیے ہوئے دیکھ لیا، ”معاف کریں دھیے، اس ٹلوی زبان کو میں لاکھ تحضر ماروں پر اس کی خصلت نہیں بدلتی۔“

”چاچا، یہ ابھی زندہ ہے، تو اسے حلال کر لے۔“

چاچے کے تن بدن میں خوشی کے مارے کمپوں کے عتابی پھول کھلنے لگے۔ ”کڑیے تو ہی اسے پھیری پھیر دے مجھے تو حلال کرنے والا کلمہ ہی نہیں آتا۔“

نور بیگم اپنے آنسو پونچھتی اُس کے قریب ہوئی۔ صاحب بہادر کو اُس کے حوالے کیا اور اس کے سر ہانے تلے ایک روپے کا ٹھپہ رکھ کر کہنے لگی ”چاچا یہ تیری افیون کے لیے ہے۔“ اور چلی گئی۔

”حق ادا کر دیا ہے تم نے نور بیگم بھتیجی ہونے کا۔“

اُس نے نہیں سنا۔ وہ جا چکی تھی۔

زمانہ کا ڈھایا ہوا اُس کا بچہ صاحب بہادر مرغا کے بھنے ہوئے گوشت کی گرمائش سے لگتا تھا۔ اُس کی ناکوں پر بڑیاں توپائی حاصل کرنے لگیں۔ ایک مدت کے بعد یہ پہلا ماس تھا جو اُس کے حلق سے اُتر اور زندہ تھا۔ مویا ہوانہ تھا بے شک۔

وہ کسی خیریت امرت کور۔ کینز قافلہ کب کی پچھلی کوٹھڑی میں جہاں صاحبان بھی تھی سوچ چکی تھی، اُس نے اس مائے تکتے مرغا کو کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا کڑی یا ہوی سکھانی نے۔

صاحب بہادر کے پاس کی گرمائش نے بیتے زمانوں کی بے انت تصویریں کو جب گرمایا تو وہ سب ہولے ہوئے لگنے لگیں۔

یہ تصویریں ہرگز صاحب بہادر کے ماس کی گرمائش سے نہ سلگتیں، اُمران میں افیون کی اُن تین گولیوں کی جھوٹ نہ ہوتی جو اُس نے نور بیگم کے عطا کردہ روپے کے توسط سے اللہ و تہ شیخ کے ہاتھوں ٹھیکے سے منگوائی تھیں۔ اور جنہیں نکل کر وہ ایک ایسی اونگھ میں چلا گیا تھا جہاں ماضی میں ڈھے چکی ساری حویلیاں سارے گھوڑے، ساری عورتیں اور سارے کچھ زندہ ہو رہے تھے۔

وہ نانا بے تک موجود تھی جو بھائی محمد جہان کے گھر کی دیوار کے ساتھ شریک تھی جس میں کیسے کیسے گھوڑے اور گھوڑیاں منہ مارا کرتے تھے۔ اور اب اُس میں ہلپیاں بچے دیتی تھیں اور کبھی کبھار کوئی خارش زدہ ٹٹا آ لیتا تھا۔ اس چھوٹے سے اسٹبل کی صفائی ستمرائی کو ایک عرصہ بیت چکا تھا۔ البتہ اس کی مٹی میں سے جب کبھی مینہ کی بوندیں پڑتیں تو گھوڑوں کی ایک بھٹی بھٹی ہو جاتی۔

بخت جہان افیون کی سرمستی اور صاحب بہادر کے ماس کی گرمائش کے خمار میں اپنے کڑکڑاتے گھٹنوں پر ہاتھ لگا کر جتنا سیدھا ہو سکتا تھا ہوا اور پھر اُس ناند کے قریب ہو کر جھکا۔ مٹی میں اُن تمام گھوڑوں اور گھوڑیوں کے لشکیلے

جنگوں کی مہک تھی جو اُس نامہ میں بھرے پانیوں پر اپنی تھو تھنیاں رکھا کرتے تھے۔ گئے زمانوں میں یہاں نہہنتے اور پھنکار تے تھے۔

اُن میں وہ اتھری اور باگی گھوڑی بھی تھی جو اُس نے نت کلاں کے سردار جسونت سنگھ کے ڈیرے سے کھول کھڑی تھی۔ اُس سردار کو اُس گھوڑی پر بہت ناز تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جس گھوڑی کے حصول کے لیے چٹانوں کے ایک قیلے سے جنگ کی تھی اور جب اُس کا قاتل جنرل اُسے لاہور کے شاہی قلعے میں دربار عام کرتے مہاراجہ کی خدمت میں پیش کرنے آیا تھا تو گھوڑی کے راستے میں گلاب کی پتیاں بچھائی گئی تھیں۔ دونوں جانب کینڑیں کھڑی اُس پر ٹھولوں کی بارش کرتی تھیں اور جب مہاراجہ نے اپنے تخت سے اٹھ کر اُس کی پشت پر تھیکی دی تھی تو وہ فوراً مطیع ہو گئی تھی۔ مہاراجہ کے بس وہی شوق تھے۔ خوبصورت عورتیں اور اتھری گھوڑیاں۔ تو یہ گھوڑی اُس کی آلِ اولاد میں سے تھی جس کے حصول کے لیے ایک جنگ لڑی گئی تھی۔ جسونت سنگھ اُسے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار اُس کی سرداری نے شکایت کی کہ جسونت سنگھ کچھ تو حیا کر۔ یہ گھوڑی عین وقت پر بھٹانے لگتی ہے۔

بخت جہان اُسے کھولنے کے لیے اکیلا نہ گیا، سنگھ دیپ سنگھ کو ساتھ لے کر گیا۔ دیپ نے جسونت سنگھ کی چار پائی کو جب تک کہ وہ اپنی سرداری کے ہمراہ اُس پر نیند میں مدہوش تھا مضبوطی سے جکڑے رکھا اور بخت جہان نے نہایت خاموشی سے اُس کے بائے کے ساتھ بندھی گھوڑی کو کھولا اور پچھلے حصے میں اُس پر سوار ہوا۔ اُس نے نہہنتا کر کچھ احتیاج کیا۔ اُس کی بات پر بخت جہان نے اُس کو تنگ کر دیا۔ اُس نے یہ سنا تو بے بسی سے چلا اور بخت جہان نے اُس کو سوار ہو گیا۔

ایک اور دفعہ مرزے کی بلی بھی تھی۔

نہ صرف اُس پاس کچھ بہات میں بلکہ اُن سے بھی پرے بخت جہان کے گھوڑیوں کے خبط کے بہت چرچے تھے۔ اور یہ چرچے مرزا بخت کے گاؤں دانا پادنگ کی جا پہنچے۔ اور وہاں سے ایک سندھیہ آیا کہ یہاں اب بھی مرزے کی گھوڑی بلی کی نسل موجود ہے تو وہ بہت پینڈ سے مارتا تھا کہ صاحب کے قریب واقع کریر اور چند کی مہاڑیوں میں آباد دانا پادنگ جا پہنچا۔ سونے کے پاؤں ادا کر کے اُس نے بلی کی نسل کی وہ گھوڑی خریدی اور جب وہ اُس گھوڑی پر سوار ہو کر ایک مرزا ہو کر اپنی ڈانگ لہراتا دنیا پور میں لٹکتا تو خدائی قسم جاتی کہ وہ انہیں ماؤں بہنوں کی گالیاں دیتا اپنی اُن زمینوں تک جا پہنچتا جو کبھی اُس کے بھائی محمد جہان کی ملکیت ہوا کرتی تھیں اور اب اُس کے ہاں اُن زمینوں پر چلتے تھے۔ اور بہشت بی بی اُس کی بھر جاتی اور اُس کی اولاد عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

جو مرزے کی بلی پر سوار ہوا اُسے کیا پرواہ کہ اُس کے مرحوم بھائی کے گھر کے چولہے پر جو بانڈی چڑھی ہے اُس کے اندر سوائے پانی کے اور کچھ نہیں۔

بخت جہان مزید جھکا، اصطبل کی مٹی کے قریب اُس کی نیلی آنکھیں ہوئیں تو اُنہیں اُس مٹی میں ایک فعل دبی ہوئی دکھائی دی۔ ذرا سا کریدنے سے ایک رنگ آلود فعل اُس کے لرزتے ہاتھوں میں تھی۔ بخت جہان نے ایک ہوکا بھرا اور اس کے ساتھ ہی فعل کے رنگ آلودلوہے پر اُس کے آنسو گرنے لگے۔

جس کی فروخت ہو چکی تھیں۔ اپنی بھی اور بھیلیائی ہوئی بھی۔

وہ جو کبھی شاندار تھا اب ایک مانگت ہو چکا تھا۔ مانگ تا نگ کر گزارہ کرتا تھا۔ محلے والے جواب بھی اُس سے دیتے تھے۔ دیکھتے تھے خیرات کے چاول چوری چھپے کنیز فاطمہ کو دے آتے تھے۔ نور بیگم جب کبھی لاہور سے دنیا پور آتی تو کچھ دے دیا کرتی وہاں لاہور جاتی۔ زینب بیگم بھی کسی آتے جاتے کے ہاتھ اُسے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی۔ اُس کا تو جس کیسے پٹر کا فونی پٹر فتح محمد باقاعدگی سے کچھ رقم روانہ کرتا پر وہ اُسے ہوا نہ لگنے دیتی۔ آپ چاہے بھوکا رہ لیتی پر عہدہ کی ہر حاجت پوری کرتی۔ اُس کے کپڑے لٹے کا دھیان رکھتی اور اُسے گرامفون کی سونیوں کی تھوڑ نہ ہونے دیتی کہ جسے اُس کے درو کا درماں تھا۔ یہی دوا دارو تھا۔ بدریا برس گئی اُس پار اور ”جب دل ہی ٹوٹ گیا“ سننا اور ان گیتوں سے اپنے منہ شہوہ جتنے کو گور کرنا۔

اگر بخت جہان کی ٹریکٹر شوکت اور شاندار رہی نہ رہی تھی تو دنیا پور بھی تو وہ نہ رہا تھا۔

اُس کے سکھ یار چلے گئے تھے۔

اپنی آبائی زمینوں کو کھوں گھروں اور شمشان گھانوں سے بے دخل ہو کر جتنے بھی چھروں اور ہلوں سے بچا کر چلے گئے تھے۔ بیشتر سرداریوں نے نت کلاں کے برگد والے کنویں میں کود کر جانیں دے دی تھیں۔ اُدھر جاندھر سے ترسہ پیاسے سے لٹ پٹ کر آنے والے بھی بیشتر مرد تھے۔ اُن کی عورتیں سکھ اٹھا کر لے گئے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں خون نہ رہا تھا۔ اُن کی زبانیں بھی نہ تھیں۔ اُن کے ہاتھ پاؤں بھی نہ تھے۔ یہاں سکھ کے گھر کا بھی گھر بنا کر لیا۔ باہر بھینوں لوگ منبوذ الحواس اپنے خجروں اور گواروں کو اُتار کے انہیں سکھوں کا خون پانا چاہتے تھے۔ بخت جہان کو بھی تو وہ اپنی اتھری پر سوار ڈاگ لہراتا نت کلاں چاہتا تھا۔ اُس کی دہشت اور ملامت کے کی دہشت کی تھی کہ لہناں سکھ اور اُس کے بھانجے کے فرار کے لیے ایک راستہ وجود میں آ گیا۔ اگرچہ وہ اپنے نت کلاں کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا مسلمان ہو کر نہیں رہ جانا چاہتا تھا۔

”نکل جا لہناں۔ اس سے بیشتر کہ یہ جان جائیں کہ میں بھی ایک معمولی انسان ہوں اور یہ جنونی میرے جسم سے نہیں۔ اور امرت کور کے لیے تو نے مجھے معاف کر دینا ہے۔ دل میں کدورت نہیں رکھنی۔ برن تلوار اور گھوڑا کسی کے ہاتھ نہیں ہوتے۔ نکل جا۔ جیاتی رہی تو کبھی نہ کبھی میل ہوگا اور ہم دونوں ایک مرتبہ پھر جوہڑ کے کنارے بیٹھ کر کیکر کی پہلے توڑ کی شربت پیئیں گے۔“

پاکستان کے وجود میں آنے کے سات برس بعد وہ صرف ایک مرتبہ نت کلاں گیا تھا۔ وہاں لہناں سکھ کے گھر میں کچھ بے روح عجیب سی اجڑی ہوئی شکلوں والے پناہ گیر رہتے تھے۔

کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ نہ وہ گھوڑی اتھری اور نہ ہی مرزے کی بلی اور نہ وہ شاندار رہی اور نہ وہ یار صرف صاحب صاحب کے گوشت کی گرماش پہنچتی تھی اور وہ بھی ہولے ہولے زائل ہو رہی تھی۔

زنگ آلو فضل اتنی بھیگ چکی تھی کہ اُس پر اگر ایک اور آنسو بھی گرتا تو وہ اسے جذب نہ کر سکتی اور اُس آنسو کو اسٹیل کی اُس مٹی میں گرا دیتی جس میں وہ ایک عرصے سے دفن تھی۔





تھی نہ سہارا نہ تھک سہا پہن بھی دن بھر اپنی زمینوں پر جنوروں کی مانند مشقت کرنے چارہ کاٹنے، بل چلانے، سہاگا پھیرنے کے بعد تھک کر گز سیدھا دارے یا چوپال کے گھن میں جوہڑ کے کنارے درمیان میں رکھے حقے کی نال گھماتے نتھنوں میں سے کڑوے ویسی تمباکو کا ڈھواں خارج کرتے اپنے مویشیوں کی صحت، فصلوں کی بڑھوتری اور پانی کی کمیابی کی تذکرے کرتے تو ان میں کہیں نہ کہیں بخت جہان کی بات بھی چھڑ جاتی.. اور بھاگ بھری کی یکدم گمشدگی کی بات بھی نکلنے لگتی..

حسین بخش بیلدار کا کہنا تھا کہ اُس نے بڑی نہر کے کنارے اس رات بخت جہان کو ہی دیکھا تھا.. اُس نے بھاگ بھری کو ان کے پیچ میں سمیت نہر میں ڈبو دیا تھا..

وہ برس جو بہت تیزی سے سرکتے گزرتے جاتے تھے اُن میں کہیں دنیا پور کے دارے میں ایک بار اتنی تھی..

اُن زمانوں میں جب گاؤں میں کوئی بار اتنی تھی تو وہ صرف اُس گھر میں نہ اُترتی تھی جس کی پھیلی کوٹھڑی میں اُس دلہن کو سنگھار کیا جا رہا ہوتا تھا جو ششوع چیر پھاڑی وہشت کے مارے دھلاؤں مار مار کر روتی چلی جاتی تھی بلکہ بے بھری کے ہر گھر میں اُترتی تھی..

اُس روز پوری برادری کی بھینسوں کا دودھ گھر نہیں جاتا تھا چوپال یا دارے میں اُترے ہوئے باراتیوں کی مدد سے لے جاتا تھا۔ کئی روز ششور دلہن والے برادری کے گھر والے سے چار پائیاں اور بستر اکٹھے کر لیتے تھے.. جب ایک چوہدرانی کے گھر پہنچا تو وہاں کوئی کوٹھڑی نہ تھی اور نہ ہی کوئی پانی کی جگہ تھی۔ لہذا وہاں سے لے کر ایک چار پائی اور اُن پر تہہ شدہ درجنوں بستر برآمد کر کے دلہن کے گھر والوں کو پیش کر دیتی تھی اور وہ بستر گزار ہو کر کہتے تھے کہ چوہدرانی پورے گاؤں میں سب سے زیادہ اور نوں گور بستر تہارے گھر سے نکلے ہیں سب کے ہاں سے پان کی چار پائیاں برآمد ہوئی ہیں پر کوئی ایک نہیں اکٹھے تین نواری پنک ہمارے آگے بچھا دیئے ہیں.. وہ چوہدرانی مدتوں اس گھمنڈ میں جتا برادری کے دوسرے لوگوں کو اپنے ششور سے بہت ترستے ہوئے دیکھتی تھی..

تو ایک ایسی ہی بارات دنیا پور کے دارے میں اُترتی..

وہ کسی دور دراز کے علاقے سے آنے والی بارات تھی پر کسی بڑے گھر کی تھی کہ وہ سب کے سب گھوڑیوں پر سوار ہو کر آئے تھے.. یہاں تک کہ اُن کے میراثی بھی پیدل نہ چلتے تھے تو رات گئے جب حقے کا دور چلتا تھا ایک باراتی نے کہا

”یہاں اس گاؤں میں کوئی چوہدری بخت جہان بھی ہے؟“

گاؤں والے تو اس نام سے سب سے سب سے پر دلہن کے عزیز و اقارب کی بنفیس بھی رکنے لگیں کہ کہیں یہ بارات صرف اس لیے واپس نہ چلی جائے کہ بخت جہان ایسا شخص اُن کی برادری میں سے ہے..

”میرا کچھ رقبہ بہاولپور سے پرے چولستان کے آخری کناروں پر واقع قصبہ یزمان منڈی میں ہے.. وہاں آپ کے ہاں ایسی زمین نہیں ہے کہ بیج بکھیر دو تو وہ سب پھوٹ پڑیں.. ویران بے آباد اور صحرائی خصلت کی زمین ہے.. اور اُسے اور ان علاقوں سے منتقل ہونے والے جانوں نے آباد کیا ہے.. شنید ہے کہ اُن میں ایک کچی عمر کا نو جوان ایسا ہے جس نے ایک بے آباد صحرائی رقبے سے ایک طویل فاصلے پر واقع کنویں سے پانی کی مشکیں بھر کے اپنی پیٹھ پر ماتھکیوں کی مانند لا کر

اُس قبرناک گرمی اور دھوپ میں فاصلہ طے کر کے اُس ریتیلی زمین پر برسوں وہ بھری ہوئی مشکیں اُنڈیلی تھیں۔ اور یہ بھی شنید ہے کہ جب رات ہوتی تھی تو اُس کی ماں اور وہ بہنیں بھی پانی ڈھونڈنے میں بخت جاتی تھیں۔ اور اب وہی برباد ہے آباد صحرائی رقبہ گل و گلزار ہو گیا ہے۔ ہریا دل اتنی ہے کہ اُس پر جو نظر ٹھہرتی ہے اُس میں بھی ہرے ہرے گل بوٹے پھوٹے لگتے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ دنیا پور کے کسی بخت جہان کے لگتے لگنے ہیں تو اس لیے پوچھا تھا۔“

دلہن والوں کی جان میں جان آئی اور انہوں نے درجن بھر حقوں کو پھر سے تازہ کر دیا۔  
 ادھر امرت کور۔ کنیر فاطمہ کے دونوں بیٹے گو بند اور نونہال بلکہ فتح محمد اور غلام محمد اُس کے پلو سے بندھے رہتے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھے روٹیاں توڑتے رہتے۔ انہوں نے اپنے باپ اور دھرم کو صرف اس لیے ترک کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے پلو سے بندھے رہنا چاہتے تھے۔ پر کسی ایک روز امرت کور نے بخت جہان کے زوال کی بوسنگھی لی۔ اُس کے ستارے گردش میں آنے والے تھے جان لیا اور اُس نے ان دونوں کو اپنے پلو سے جھٹک دیا۔ اور جھڑک کر بولی اس حویلی نے سدا باغ بہاراں نہیں رہتا۔  
 پہلے تو وہ شدید صدمے میں تھے اور پلوں کی مانند چوڑوں چوڑوں کرتے اپنی ماں سے پھٹنے لگے پر پھر انہیں چائن ہو گیا کہ وہ چتر کی ہو چکی ہے اور اگر وہ عمر بھر اُس کے تلوے چائے رہیں تو بھی وہ انہیں دوبارہ اپنے پلو میں بندھنے والی نہیں۔ انہیں گھر سے نکلتا ہوا۔ ان دونوں کے ڈکھڑے اور داستا نہیں بہت المناک اور الگ الگ ہیں۔ فتح محمد بھوکا ہوا بھوک کا فنا در بدر ہوتا گیا۔ ان دنوں کی بھرتی کئی ہوں گی۔ کسی نے کہا کہ وہ کد کاٹھ اس جیسا نہ تھا۔ وہ فوراً بھرتی کر لیا۔ بے حوی اور بیوقوفی کے جروے اسے اپنے پہلے باپ لہناں سنگھ سے وراثت میں ملے تھے اور وہ تھوڑے عرصے بعد ہی بیداری کی نظروں میں آ گیا۔ وہ بلا سوچے سمجھے حکم ملنے پر کسی بھی خطرناک صورت حال میں کود جاتا۔ اگر فوجی مشقوں کے دوران دشمن کی جانب پھینکا جانے والا گرنڈ گرنڈ پھٹ نہیں رہا صرف ہاتھوں دے رہا ہے اور سب لوگ خندقوں میں سر چھپائے اُس کے پاس کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تو وہ جھوٹا جھوٹا شہدائے حق سے نکل کر گرنڈ تک جاتا اور اُسے ہاتھ میں اٹھا کر تا دیر اُس کا مطالعہ کرتا کہ یہ کیوں نہیں پھٹتا۔ اور گرنڈ کو بھی علم ہو جاتا کہ وہ گو بند سنگھ عرف فتح محمد کے ہاتھوں میں ہے تو وہ محسوس ہو کر رہ جاتا۔

ہر ماہ باقاعدگی سے کنیر فاطمہ کو اُس کی پوری تنخواہ کا منی آرڈر وصول ہو جاتا اور وہ اُس میں سے کچھ رقم دو بارہ خرچے پانی کے لیے اپنے فرماں بردار بیٹے کو واپس بھیج دیتی۔  
 البتہ نونہال سنگھ یعنی غلام محمد کا معاملہ الگ تھا۔  
 وہ اپنی ماں کے پلو سے کھلا گھر سے نکلا تو دو چار برس یوں گم رہا جیسے کہتے ہیں کہ جانے اُسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ کچھ سراغ نہ ملا۔

ایک سویر جب بخت جہان بیدار ہوا چار پائی کے سہارے کھڑی ڈالنگ گرفت میں لے کر اُسے حسب عادت زمین پر کھڑکاتے ہوئے ماں کی گالی دے کر کنیر فاطمہ کو پکارا جو محن میں ہانڈی روٹی میں مصروف تھی۔ وہ پیار میں آئی تو سر سے پاؤں تک گہنوں ٹوہیوں میں لدی چھم چھم کرتی آئی۔



جستہ جہان کی آنکھیں زیورات کی لشکر سے پھنی کی پھنی رہ گئیں۔ ”یہ سب تجھے کس یار نے دیئے ہیں گڑی یا ہوئے۔“

جھاتیوں.. یہ میرے ہر نوں نہال نگو نے دیئے ہیں.. تم گھوک سوئے ہوئے تھے چھپلی رات جب رو آیا تھا..

میرے بچے کے ساتھ دیر تک لگ کر رہتا رہا۔ کالج میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ یہ کہنے وہ دے گیا ہے۔"

”چرواہاں سگھ کا جنم.. یہ اتنے ڈھیر سارے کہنے لایا کہاں سے ہے.. کہیں ڈاکو ڈالا ہے..“

”آہو!“ کنیر فاطمہ نے سینہ پھلا کر کہا ”تو نے بوجھ لیا ہے... وہ ڈکیت ہو گیا ہے واو گرو کی کرپا سے... گوجر انوالہ

”میرے شیخو پرے تک جتنی خدا کی ہے وہ اُس کی وہشت سے رات بھر سوتی نہیں تیری طرح ڈالیں کھڑکاتی رہتی ہے۔“

آنے والے دنوں میں جب کبھی وہ بیدار ہوتا اور کثیر فاصلہ و میزے میں گھنٹوں ٹوہنیوں سے لدی چھم چھم کرنی

جانتا تھا کہ راتِ غلام محمد چوری چھپے آیا تھا۔ پھر لہناں سنگھ کا تھناں اُس کا ختم ہونا تو اُس سے مل کر جانتا چلا ہے وہ

اگرچہ اہل اہل مار مار کر اُسے پھنسا کر دیتا ہے مگر اُسے مل کر ضرور جاتا۔ اُس نے ان برسوں میں اُس کی شکل بھی نہ دیکھی۔

کچھ عرصے آن زلیات کو چھوڑنے بھی یہ یقین رکھیں کہ ان کے پاس وہ پوسٹ کوئی ہے کہ جہانیاں میں نے اپنے دونوں ہتھ

ہوتے ہیں۔ پھر انہوں کو سونپنے لادینا ہے تو ان پر نظر نہ رکھ... صاحبان کا علاج معالجہ بھی کرنا ہے۔ علی کے زمانے

جیسے تھے بہت جلد ان کے اُسے بہت ڈرایا دھمکایا۔ منت تو را بھی کیا کہ بھاگاں والیے تو ایک آدمی کو ہی دے دیا کہ

پانی چل رہا ہے گا پروہ اڑی رہی..

UrfuPhoto.com

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بے حد غصہ ہوئی اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر یہ سب کچھ ہوتا تو میں کیا کرتی؟

خبر کے یہی نام دیوں گا اس کو دھڑکا لے کر رو بہ جنت جہان کے طرف میں۔ اس میں کچھ دواں دیا گیا ہے۔

کھینچ کر اس کے لیے ایسا پتہ پیدا کر دیا ہے جس کی بات ان کے ہاتھوں سے ملے گی۔

...ایک سوئے ...

اس کے ساتھ ساتھ ہرگز نہ سوچیں کہ اس میں کوئی عیب ہے۔ جیسے کہ ان کی مرضی سے، ایسے لوگ اسے

[illegible]

تو نے کہا کہ میں نے اس کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کو دیکھا ہے۔

تو کچھ دن عزت آرد کہ گزر جائیگا۔ مہینوں کی شادیوں اور صحابا کے لئے نقد زور کافی سے زیادہ

تجربہ و حس عادت اُسی طور منہ اندھیرے باہر بیٹھنے کے برائے گھر کے (نئی) قبرستان پہنچی اور محمد جہان کی قبر کے سامنے

کے متنی ایک ٹکڑی سے کھودنے لگی۔ سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی قبرستان سے برے کھیتوں کے درمیان ایک کتے

تھے بریل کا نام دے براؤ اٹھائے چلتے ایک کسان نو جوان کے سوا آس پاس کوئی بشر نہ تھا۔ اُس کے حساب سے مٹی میں

جس گہرائی تک وہ بوٹی اُس کے ہاتھوں کو لگ جاتی جاے تھی نہ لگی۔ اُس نے کچھ اور گہرا کھودا اور جب سوائے مٹی کے

میں کے ہاتھ کچھ نہ آیا تو وہ ایک خوفزدہ اضطراب میں مبتلا ہو کر گھر بی بی کی بجائے قبر کے سر ہانے کو دونوں ہاتھوں سے

تیزی سے کھودنے لگی جیسے ایک نیولا سانپ کی تلاش میں اُس کے بل کودنوں پنچوں سے کھودنے لگتا ہے۔ مقام وہی تھا جہاں اُس نے پولی چھپائی تھی لیکن وہاں اب سوائے مٹی کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ ایک ہسٹریائی حالت میں بے مہار غصے اور مایوسی میں جھٹلانا صرف سر ہانے بلکہ قبر کے بقیہ حصے پر بھی ہاتھ چلانے لگی۔ اُس کا چہرہ مہرہ مٹی کی تہہ سے اٹا ہوا تھا کہ وہ اب اُس گڑھے میں سر ڈال کر اُس کے اندر دیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی اور اُس کے پہلو میں کھودی گئی مٹی کا ڈھیر قبر سے بھی ذرا اونچا ہونے لگا تھا۔ سویر کی ہلکی سفیدی کھیتوں اور قبروں کو واضح کر رہی تھی جب چارے کا گنھا اٹھائے ہوئے اپنے کنویں کی جانب جاتے ہوئے قائم دین بھرانے اُسے دیکھ لیا۔ پہلے تو وہ چارے کا گنھا زمین پر پھینک کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھنے کو تھا کہ جانے یہ کیا بھوت پریت ہے چڑیل ہے جو نبرداری کی قبر کو ایک نیولے کی بے چینی سے کھود رہی ہے اور پھر اُس نے اُسے پہچان لیا اور شور مچا دیا۔ لوگو... لوگو... اوئے لوگو دوہائی رب کی.. بخت جہان کی سکھنی ہمارے بھرا نبرداری کی قبر کھود رہی ہے اُس کی ہڈیاں چبانے کے لیے۔

سر سے پاؤں تک مٹی سے لپٹی ہوئی قبرستان کے بالوں سے گھسٹ کر لائی جانے والی کینر فاطمہ جب بخت جہان کے ویڑے میں ڈھیر کر دی گئی تو کسی چڑیل سے بڑھ کر خوفناک دکھائی دے رہی تھی.. بخت جہان اُسے ایک پلے کی مانند اٹھا اٹھا کر زمین پر پختار ہا.. بول امرت کورے.. تو میرے بھرا کی قبر کیوں کھود رہی تھی.. اس بری طرح اُسے زد و کوب کرتا رہا کہ وہ اٹھنے تو کیا دیکھنے اور سننے کے قابل بھی نہ رہی.. نبرداری کی قبر کی وہ مٹی جس میں وہ اتنی تھی خون آلود کچھ بکھری ہوئی تھی۔ وہ مٹی روٹی کی مانند تھی۔ اُس کی روزنک مار پیٹ کا یہ تسلسل چھوڑی رہا یہاں تک کہ بخت جہان کے بازو شل ہو گئے۔ اُس میں اُسے مزید پیٹنے کی سکھ نہ رہی.. پر اُس میں اتنی سخت بھی کہ وہ روزانہ اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا چوکھٹ کے پارنگلی میں دھکیل دیتا کہ کوش ہونا مراد چڑیلے میرے بھائی کی لاش کھائے.. میرے گھر کے اندر اب قدم رکھا تو میں تمہاری گھروں کا منکا توڑ دوں گا.. وہ رات بھرنگلی میں پڑی رہتی اور پھر گھسنتی ہوئی گھروں کے دروازوں پر دھک دھک کرے.. پر وہ بولی نہیں.. پھر ایک چشم حافظہ جی کی منت سماجت کرنے پر جنہوں نے تقریباً پچیس برس چندشتر آن دونوں کا نکاح پڑھایا تھا کہ چوہدری یہ سکھنی اگرچہ سوداغن ہوگئی ہے پر ہے تو اللہ کی مخلوق.. اسے اس کے حال پر چھوڑ دے.. اس میں اور اچھوٹے میں کچھ فرق نہیں.. اسے معاف کر دے.. بعد میں جتنے برس بھی وہ زندہ رہا بخت جہان کبھی لاڈ پیار سے اور کبھی گالیاں بکتا ہوا ہر دو چار روز کے بعد اُس سے یہی سوال کرتا رہا کہ امرت کورے.. پر اس کا جواب کبھی نہ آیا..

بس یہی وہ دن تھے.. جب امرت کور اُس کے بھائی نبرداری کی قبر کھودتی چھوڑی گئی تھی جب اُس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے اُس بھرا کی یاد میں رونا دھونا شروع کر دیا..

محمد جہان کی دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں اپنی آل اولاد سمیت سکون اور طمانیت کی حیات گزارتی تھیں..

زیب بیگم وزیر آباد سے پرے چناب کے کناروں پر واقع جانوں کے ایک ایسے گھر میں بیابھی گئی تھی جو







سلگتے اُپلوں کو تکتا رہتا جن کی طفیل اُسے روٹی پانی نصیب ہوتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کھانا کھاتے ہوئے کوئی لقمہ اُس کے میز سے قلع میں اُٹک جاتا اور زینب کا رنگ فق پر جاتا۔ وہ اُنھ کو اُس کی گردن کے پچھلے حصے پر زور زور سے دھپنے مارتی اور لقمہ کھانتے ہوئے بخت جہان کے قلع سے اُتر جاتا۔ نور بیگم کبھی نہ اٹھتی وہ اپنی بڑی بہن کی نسبت ذرا کٹھوردل کی تھی ماضی کو بھلا نہ سکتی تھی۔

ہر سویر بیدار ہو کر زینب بیگم اپنے چاچے کے صحن کا رخ کرتی۔ اُس کا حقہ تازہ کرتی۔ کزوے تمباکو کو تھیلیوں میں مسل کر اُس پر گڑ کی ایک ڈھیلی بھا کر ٹوپی میں سلگتے اُپلے بھرتی اور پھر اُو گھتے ہوئے بخت جہان کے کھلے منہ میں حقے کی نال دے دیتی اور وہ اُس پر یوں منہ مارنے لگتا جیسے ایک بچہ دودھ کی بوتل کے نپل پر منہ مارنے لگتا ہے۔ پچھلے پہر وہ اُسے خود پانی میں گھول کر اُفیون کی تین گولیاں پلاتی اور پھر احساس جرم کے مارے آبدیدہ ہو جاتی کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں۔ نیک پاک اعمال کرنے کی بجائے اپنے چاچے کو اُفیون پلا رہی ہوں۔ اُس چاچے کو جو میری ذولی کے تعاقب میں چناب کے کناروں تک گیا تھا۔ پر اُس کے دل میں وہ سب کدورتیں فحش ہو چکی تھیں۔ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ اگر اُفیون میں دو تین دن کا ناغہ ہو گیا تو شاندار صحرائے گا۔ وہ جیسا بھی تھا اُس کے باپ محمد جہان اور چاچے الف جہان کا بھائی تھا۔ اُس کا رجا چاچا تھا۔

نور بیگم کٹھوردل والی تھی وہ اُن کدورتوں کو دفن نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے وہ کبھی تھی کہ چاچا میرا صاحب بہادر مر بھی جائے تو میں اس کے کھسکے ہوئے بھیک آؤں گی۔ حق نہیں بل کہ وہ کھسکے ہوئے بھیک آؤں گی۔ اُس کے مرنے کی منتظر نہ رہی اُسے زندہ حالت میں چاچے کے سپرد کر آئی پر وہ بھول نہ سکی تھی۔

بس یہی وہ دن تھا۔ جب امرت کو راس کے بھائی ہمدرد کی قبر خود قی پکڑی گئی تھی جب اُس نے راتوں کو اُنھ اُنھ کر اپنے بھرا کی یاد میں رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے رونے چپکلیاں بھرنے کی بھرائی ہوئی آواز حملہ مغربی کی گلیوں اور کچے گھروں میں ٹکراتی پھرتی۔ چچتو ماچھن دیکھتے ہوئے تندور میں پک چکی روٹیوں کے لیے جھانکتی ساکت ہو جاتی اور وہ ساری روٹیاں جل بھن کر کالی سیاہ ہو کر تندور کی آگ میں گرنے لگتیں۔ روٹیاں لگوانے والی عورتیں اپنا گندھا ہوا آنا سروں پر رکھ کر گھروں کو لوٹ جاتیں۔ اچھو شیخ جس کی ماں نے اُسے بمشکل قابو کر کے بستر پر لٹایا تھا وہ اُنھ بیٹھتا اور اُس کی ہبہ رگ ایک تیز دھار شیشے سے کٹ جانے کی آرزو میں دھڑکنے لگتی۔ بابو بھارن اپنے پر بوجھ ہوئے بھئی کی طرح دیکھتے بدن کے گھروالے کو دھکیل کر پرے کر دیتی کہ وہ آج پھر بین کر رہا تھا۔ روتا گرا لاتا تھا۔

کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ نہ وہ گھوڑی اتھری اور نہ ہی مرزے کی بلی اور نہ وہ شاندار می اور نہ وہ یار۔ صاحب بہادر مرغ کے گوشت کی جو گرماش پچی تھی وہ بھی شام اُترنے کے ساتھ زائل ہو چکی تھی۔ رنگ آلود فعل جو اتنی بھیک چکی تھی کہ اُس پر اگر ایک اور آسو گرتا تو وہ اُسے جذب نہ کر سکتی۔ اُس پر بخت جہان کے آنسو پھر سے ٹپ ٹپ کرنے لگے اور فعل

جس جذبہ نہ کر سکی اور وہ اصل کی مٹی میں گرنے لگے جیسے بخت جہان نہیں وہ فعل آنسو بہاتی ہو۔ وہ آنسو پہلے کی طرح غامض نہ تھے ان کے ساتھ بخت جہان کی ہچکیاں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کو یاد کرتا رونے لگا ایک ڈار سے بھرتی ہوئی کوچ کی مانند گرانے لگا۔ اور محلہ مغربی کے اوپر جتنا بھی آسمان تھا اُس پر وہ گراہٹ دو ہائیاں دینے لگی۔ جیسے سٹی یاد کرتے ہیں ایسے وہ بھائیاں باجھ نہ جوڑیاں بھائیاں باجھ نہ جوڑیاں رو رو کر پڑھتا تھا۔ اور جب اُس کی گراہٹ اور کچھ بھی بڑھی آواز سے متاثر ہو کر بھی اور خوفزدہ ہو کر بھی محلے کے کینوں نے اپنے دیے بجھا دیے مبادا وہ اُن پر پل چلے کہ میں اپنے بھرا کے لیے روتا ہوں اور تم چراغاں کر رہے ہو گڑی یا ہو یو۔ تب کچھلی کوٹھڑی میں سے چینی ایک فریاد آئی۔ چاچا اب بس کر۔۔۔ تجھے تو تیرے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔

اور بخت جہان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اُس نے اپنی آخری ہچکی کو گلے میں گھونٹ لیا۔ رخساروں پر بہتے آنسو بھی نہ پونچھے اور یکدم چپ ہو گیا۔ اپنے آپ پر جبر کر کے اپنی آخری ہچکی کو بھی اپنے آپ میں دفن کر کے چپ ہو گیا۔ وہ کبھی کسی بندے بشر کے حکم یا خواہش کے ماتحت نہیں ہوا تھا۔ یہ تو کیا وہ کبھی کسی کو سزا دیتی تھی اور آنسو اُس کے اندر دم توڑ گئے۔ کچھ فاطمہ کے بطن سے وہ اُن کی اگلی اولاد تھی اور وہ اُسے پکارتی تھی کہ۔۔۔ چاچا اب بس کر۔

صاحبان ایسے بنے اپنے والدین کے لیے ایک ایسا امتحان ہوتے ہیں کہ وہ ہر لمحے جیسے اپنے بننے کو مرنا دیکھتے ہیں پھر قبر میں اُٹارتے ہیں ابھی فارغ نہیں ہوتے تو وہی بننے اُن کے ہاتھوں میں دوبارہ جان دے دیتا ہے۔ تھوڑی بہت سزا دی اپنا بن جائے۔ ان کا کردار وہی ہے جو پیدائشی طور پر ڈاؤن سنڈروم کا شکار ہوتے ہیں جنہیں منگولائیڈ بھی کہا جاتا ہے اُن کو والدین کو بھی ابتدائی صدمے کے بعد کسی حد تک ایک جبر یہ مبرا آ جاتا ہے۔

لیکن صاحبان کا حال بدل جاتا تھا۔ وہ پیدائشی ایک مسخ شدہ کچلے ہوئے ناکارہ اور غیر حتمی میڑھے بدن کے ساتھ ہوئی نیم مردہ بازو سکڑی ہوئی ناکیں پسینے سے لپکتی ہوئی ایک انداز سے منہ کی بجائے ایک عفریت لگتی تھی لیکن سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس تڑے مزے بدن کے اوپر جو چہرہ تھا اُس کی خوش شکلی میں کوئی کلام نہ تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایک ماہو ہو سکتی تھی اور اُس سے بڑا آزار یہ تھا کہ اُس چہرے کے اندر جو دماغ تھا وہ بے حد زرخیز تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے مالا مال تھا۔ وہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی آزمائش تھی آسمان سے نازل ہونے والا ایک ایسا جہنم تھی جس کی آگ شعلہ ہی نہ ہوتی تھی۔ جب انہیں بتایا گیا تھا صاحبان ایسے بننے جن کے بدن میں مسلسل ایک اذیت بھری توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیس برس کی عمر پا سکتے ہیں۔ تو بخت جہان یہ خبر سن کر گہرے دکھ میں چلا گیا۔ اُس کے دل کے پتھر لیے پن کو اس نئی نے موم کر دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی مینے میں ایک آدھ بار حسرتی ہوئی اپنی نیم تاریک کوٹھڑی میں سے نکل کر اُس تقریباً ڈھچکی کوٹھڑی میں چلی جاتی جس میں گراموفون ریکارڈوں کا ایک ڈھیر ڈھول میں پنہاں ہوتا تھا۔ اُن میں سے کچھ ابھی سلامت تھے۔ کبھی سہیل کبھی ماسٹر مدن اور کبھی مکلا جھریا کی آوازیں صحن میں آنے لگتیں اور کینز فاطمہ کو خبر ہو جاتی کہ صاحبان میں آج اتنی ہمت ہو گئی ہے اُس کی طبیعت اتنی سنبھل گئی ہے کہ وہ اُس کوٹھڑی میں پہنچ کر گراموفون کی سوئی بدل کر اُسے ریکارڈ پر رکھ کر اپنی پسند کے گیت سن سکے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ وہ میڑھے تک چلی آئی ہو۔ بہر طور وہ اُس



گھر کی چوکھٹ کے پار بھی نہیں گئی تھی۔

وہی حافظ جی جو اُس کی سکھائی ماں کا نکاح پڑھانے آئے تھے وہ کنیر فاطمہ کی منت سماجت پر اور ہر ماہ دو ٹوپے چاول اور دس ٹوپے کنک کے عوض اُسے اردو قاعدہ اور قرآن پاک پڑھانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ یہ تب ہوا تھا جب صاحبان چھ برس کی ہو گئی اور ایسے سوال پوچھنے لگی جن کا جواب کم از کم کنیر فاطمہ کے پاس تو نہ تھا۔

حافظ جی ایک آیت پڑھ کر اُسے سناتے اور وہ ہرانے کے لیے کہتے تو وہ پوری آیت صرف ایک بار سننے کے بعد فرود ہرادی اور وہ بھی حافظ جی کے معرب لہجے میں۔ اردو قاعدہ اُس نے دو دن میں پڑھ لیا اور زبانی یاد کر لیا۔

اُن حافظ جی کو پختہ یقین تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ صاحبان پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ اُس پر کوئی جن قابض ہے ورنہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ ایک چھ برس کی بچی اور وہ بھی معذور یا دوا داشت کا ایک ایسا معجزہ رکھتی ہو۔ اُس کے میڑھے میڑھے بدن کے اندر نکست و ریخت کا ایک مسلسل عمل جاری تھا اور وہ اس بدنی عذاب میں مبتلا راتوں کو سونہ سکتی تھی۔ جب اذیت سہی نہ جاتی تو وہ چاہے پائی، مکے پاسے، پانی یا کوئی اور شے لے کر اندر دماغ کی جوشادابی تھی وہ مسلسل سوال کرتی کہ آخر کیوں؟ میں ہی کیوں؟

وہ اُس نیم سار ایک کونخڑی میں اپنے بستر پر پڑی پڑی جوان ہو گئی۔ کنیر فاطمہ کے لیے اب ایک اور عذاب شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ اُس کی غلاظت صاف کرتی تھی اُس کے بدن کے حصوں کو دھوئی تھی اور اب اس کی بلوغت کی

UrduPhoto.com

ماہوار نمود کا دھبہ بھی نہ کھاتا تھا۔ باہر ہی دنیا سے صاحبان کا واحد رابطہ مہاروں کا لڑکا پیو بخش تھا جس کی آمد پر کنیر فاطمہ اُس کی پیو گزار ہوتی کہ صاحبان کی چاندنی کھینچنے کے لیے بھی بہت حوصلہ درکار تھا۔ اور وہ اس سے دوستوں کی طرح باتیں کرتی اور احوال پوچھتا۔ پیو بخش وزیر آباد سے پہلی سکول میں میٹرک کا طالب علم تھا چنانچہ اُس کا وہاں روزانہ آنا جانا لگا رہتا۔ اور اکثر اُس کی جیب میں ناولوں اور رسالوں کی ایک بڑھتی ہوئی جھونپڑی لٹکتی رہتی۔ کنیر فاطمہ نے صاحبان کی فراہم کردہ رقم سے خریدتا اور دنیا پور واپسی پر اُس کے حوالے کر دیتا۔ صاحبان کے لیے کثرتِ مطالعہ سودمند ثابت نہ ہوا۔ چوکھٹ کے پار وہ اُس جہان سے واقف ہو گئی جسے دیکھنا بھی اُس کے نصیب میں نہ تھا چہ جائیکہ وہ کبھی اُس میں چلتی پھرتی۔ اُس میں حیات کرتی۔ چوکھٹ کے باہر روٹی کے پتھر کتنے اُس سے اچھے تھے۔ وہ چوکھٹ کے باہر جو تھے۔

کنیر فاطمہ نے تو محض عشق کی خاطر رکی طور پر مذہب بدلتھا، بخت جہان اگر ہندو ہوتا تو وہ رام نام چنے لگتی، اُسے اس مذہب سے بھلا کیا لگاؤ ہو سکتا تھا جس کی الف بے سے اُس کا خاندان بھی واقف نہ تھا کہ اس واقفیت کی اُسے کبھی کبھہ حاجت ہی نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی عورت تھی، لمبناں سنگھ کے گھر میں تھی تب بھی وہ باقاعدگی سے گرنٹھ صاحب کو متھا مینے والی گورو بانی الاپنے والی عورت تھی۔ اُس کی یہ خصلت بدلی نہ تھی وہ اب بھی باقاعدگی سے نماز پڑھنے اور متھا مینے کی کوشش کرتی۔ رمضان کے مہینے میں پورے روزے رکھتی۔ جب وہ صاحبان کو پیو بخش کھارے سے منگوئی ہوئی فضول کتابوں پر ہمہ وقت اپنے لرزش میں آئے ہوئے سر کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی جھکی ہوئی دیکھتی تو اُسے بہت قلق ہوتا۔ اُس نے پورا قرآن پاک دنوں میں پڑھ لیا تھا پر وہ اُس پر کبھی نہ جھکتی تھی۔ اُس کی



خود بخش تھی کہ وہ اپنے سونے رب کی لکھی ہوئی کتاب بھی پڑھے۔ ایک بار اُس نے گجرات کے سائیں کاواں والی سرکار کے دربار سے لائی ہوئی ایک تصبیح اور ایک تعویذ اُس کی اپانج گود میں رکھتے ہوئے لجا جت سے کہا ”صاحبان! کبھی تصبیح بھیر لیا کر۔۔ اللہ اللہ کر لیا کرو جیسے۔۔“

نیم مردہ بازوؤں کو اپنی اُس گود میں سینتی جس میں ایک تصبیح اور ایک تعویذ متروک حالت میں پڑے تھے بے اختیار جنبش میں آتے سر کو سنبھالتی اور اپنے پار ایک ترچھے ہوئے نازک لیوں سے اور آنکھوں کی سیاہ سرانگیزی سے مسکراتے ہوئے صاحبان کہنے لگی ”پر کیوں؟“

”اُس کا شکر ہم پر واجب ہے۔“

”مجھ پر نہیں۔“

”صاحبان وہ ہمیں جس حال میں رکھے ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے۔“

”اس حال میں بھی؟ کس چیز کا شکر ادا کروں؟“ اُس نے نکل خدائی کو بنایا اور پھر مجھ تک آتے آتے بناوٹ سجاوٹ سب بھول گیا۔ بس مٹی کا ایک ٹھوہنا بنا کر اُس پر سر لگا دیا۔ مجھے ایک عفریت بنا کر ملائیں سیفر دیں بازو لٹکا دیئے۔ میری کمر پر ایک کوہان بٹا دیا اور پھر ان میں دن رات کی مسلسل ٹیمیں اور تیز دھار درد کے برچھے چھوہ دیئے۔ تو میں ان کا اس حال کا شکر ادا کروں۔ کیا اس حال میں بھی شکر واجب ہے یا اُس کا انکار واجب ہے۔“

وہ چپ چاپ رہی اور اُس کا غصہ فاطمہ تھی سنا لیا۔ مٹی اور لکڑی کو یاد کرتی تو اس کا سنا لیا۔

”صاحبان! یا شکر نہ بن۔“

”وفاقی میں بن چکی ماں جی۔ اُسے کہو کہ مجھے شکر کا کوئی ایک جواز مہیا کر دے تو میں شکر کروں گی۔“

بخت جہان اس کی ہنسنا شکر کی اولاد کی پکار پر بغلت چپ ہو گیا تھا۔

آنسوؤں سے آلودہ رخساروں پر اُس بکار نے اتنا اثر کیا کہ وہ بھی خشک ہو گئی اور وہ اپنے نمبر دار بھائی کو لہجول کر اپنے بچ سے پھوٹنے والے ایک سوکھے ٹیکر کے ترے مزے فٹڈ کے لیے آرزوہ ہوا جو کہ اُس کی بیٹی تھی۔

اُس نے وہ رنگ آلود فعل اتنی دیر سے تمام رکھی تھی اور اُس پر اسنے آنسو بہائے تھے کہ وہ اُس کے بدن کا ایک ایسا حصہ ہو گئی تھی جو الگ نہ ہو سکتا تھا۔ بخت جہان نے اس بھیگ چکی فعل کو جہاں سے وہ ظاہر ہوئی تھی وہیں اُس اسطبل کی مٹی میں دبا دیا اور پھر اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے شکستہ ہوتی ناند کی بھرتی ہوئی سرخ اینٹوں کا سہارا لے کر اٹھا اور پھر صاحبان کی اب مکمل طور پر رات میں مزید رات ہوتی اندھی کوٹھڑی میں ٹھوکریں کھاتا داخل ہو گیا ”صاحبان بچر۔“

”ہاں چاچا۔“

وہ اُس تاریکی میں ایک ہیولا بھی نہ تھی۔ کہاں نظر آتی تھی تاریکی میں تاریکی کہیں تھی۔

”بچر۔ تجھے بہت درد ہو رہی ہے؟“

”آہو چاچا۔“ صاحبان کا متحرک دماغ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا کہ آج میرے اس باپ کو کیا ہوا ہے جس

نے کبھی پرواہ نہ کی تھی، کوٹھڑی میں جھانکنے سے بھی گریز کرتا تھا اور آج مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ پٹھر تجھے بہت درد ہو رہی ہے۔۔۔  
گھپ اندھیرے میں دیکھا تو نہیں جاسکتا پر اگر کوئی دیکھ سکتا تو بخت جہان کی بچھتی نیلی آنکھوں میں سے  
جھرنوں کی مانند پھوٹنے والے آنسوؤں کو دیکھ لیتا۔۔۔

”پٹھر میں تیرے لیے کیا کروں؟“

”چاچا.. تو برابر کی کوٹھڑی میں گرد سے اٹے گراموفون کی چابی بھر.. ایک نئی سوئی لگا کر اُس پر وہ ریکارڈ رکھ  
دے.. بدریا برس گئی اُس پار.. اگر تو اس اندھیرے میں وہ تلاش نہ کر سکے تو ”غم دیئے مستقل“ پر سوئی رکھ دے۔ ان کے  
سننے سے میری دردیں اور ٹہپیں جو مجھے سونے نہیں دیتیں، کم ہو جاتی ہیں مجھے سکھ ملتا ہے.. میں نے اگر شکر ادا کرنا ہے تو ان  
گیتوں کا کرنا ہے جو میرے دکھ کم کرتے ہیں۔ اُس کا کیا کرنا ہے جس نے مجھے یہ دکھ دیئے اور مستقل دیئے۔“

گاؤں کی تاریکی میں جہاں ابھی بخت جہان کی آواز اری کی صدا آئیں ہر در پر دستک دیتی تھیں اور دینے بجاتی  
تھیں اب وہاں خورشید، مکیش اور جیو، بالو کا گایا ہوا گیت ”بدریا برس گئی اُس پار“ نئی دروازوں پر اپنی کو ملتا اور بدھ رہن  
کے کوئل ہاتھوں سے دستک دیتا تھا کہ اپنے دینے پھر سے روشن کر لو اور صا جہاں کی دردوں اور آوازوں پر نکور کرتا انہیں کم کرتا  
برداشت کے لائق بناتا تھا.. بدریا برس گئی اُس پار!“

UrduPhoto.com



محلہ مغربی کی مسجد کے صحن میں کنویں کے قریب ایک کچے چوہرے پر کھڑے اُس ڈھنڈا لود سویر میں ایک حالت سے وہاں کے امام حافظ جی کانوں پر ہتھیلیاں جمائے ایک لرزتی آواز میں اذان دے رہے تھے اور جب وہ جسے اطلاع پکارتے تو اُن کے ناتواں پیچھے ہٹنے کی بجائے وہ اُن کی کارہ بانیں آنکھ مزید بھینچ جاتی..... لاکھ کوشش کے باوجود وہ بھی دل میں استغفار کرنے کے باوجود اُن کی توجہ جھٹک رہی تھی.. میں ان بے دین لاکھ پڑھ جانوں کو کتنی محلات سے فلاح کی جانب بلا رہا ہوں اور ان پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا کیسی ڈھیلے بھیلے کے بنے ہیں۔ فجر کی نماز کے لیے جو دس بارہ لوگ ایک ایک کر کے مسجد میں داخل ہوتے ہیں اُن میں سے بیشتر کمی کمین 'جولا ہے' لوہار یا گھبراہٹ میں آئے ہوئے ایک شخص یا ایک شخص کا چاہنے والا ہے تو ان کے لیے اندھا دھنیاں کر رہا ہوں کہ مجھ سے تمہیں اور کیا بند کر رہا ہے میں اپنے ڈھور ڈھور چوڑا کر آیا ہوں تو میری شخص کو پیٹی ہوئی کہیں؟.. یہ جانتے نہیں حافظ جی کو بھی اپنا ایک کام ہی سمجھتے.. نانیوں 'میراھیوں' یا جولاہوں سے ذرا فطرتی سمجھتے پر کام ہی سمجھتے جن کا کام مسجد کی صفائی تھوڑی کرنا.. اذانیں دینا.. مَر دے نہلانا.. قبر پر کھڑے ہو کر علیٰ عین دعائیں کرنا.. سقاووں میں پانی بھرنا اور بچوں کو سپارے پڑھانا.. ایک ایک کے گوشہ گوشہ میں جادو بکھیرنا.. مغربی محلے ہر جاٹ گھرانے کے باہر کھڑے ہو کر صدا لگاتے تھے کہ بہن جی مولوی جی کی گلی..

تو اُن کی پھیلائی ہوئی چادر میں وہ بہن جی.. کوئی ایسی چوہداری جس کے پلے میں سوائے جاٹ ہونے کے تکبر کے اور کچھ نہ ہوتا اُن کے حصے کی گلی.. ایک روٹی اُن کی جھولی میں ڈال دیتی.. اور وہ روٹی.. اور ہر روٹی ایک پچھلے ہوئے ہوئے کی مانند اُن کی جھولی جلا ڈالتی.. وہ اتنی تھیک محسوس کرتے.. اتنی ڈھیر ساری دیسی گندم کی موٹی تنور کی روٹیاں وہ خود تو کھا نہیں سکتے تھے وہ اُن کی بھینس کے کام آتیں.. گاؤں بھر میں سب سے پلٹی ہوئی بھینس ہمیشہ مولوی صاحب کی ہوتی تھی کہ وہ روزانہ دیسی گندم کی موٹی روٹیوں کی چگالی کرتی تھی.. بہت سے لوگ صرف ایک روٹی کو ترستے تھے پر مولوی صاحب کی بھینس درجنوں روٹیوں پر منہ مارتی موٹی ہوئی تھی.. بھینسوں کو بھی مذہب کے فربہ فوائد ہوتے ہیں..

فجر کی اذان اور نماز کے بعد جب حافظ جی ایک بوسیدہ ہو چکی صف پر لیٹے کمر سیدھی کر رہے تھے تو کینز فاطمہ آگئی.. حافظ جی.. وہ ساری رات گھر بکیتی رہی ہے صاحبان.. آپ نے اُسے قرآن پاک پڑھایا اور کئی بار اپنے من کی موج میں سپارے کے سپارے منہ زبانی پڑھتی جاتی ہے پر اب ایک اور عذاب نازل ہو گیا ہے.. وہ میں کیا بتاؤں کہ کیا کیا



کہتی ہے اُس ذات کے بارے میں.. آپ سیانے بیانے ہیں آپ ہی اُسے کچھ سمجھائیں.. مہربانی کریں حافظ جی..“

صبح میں پھیلی ہوئی سویر کی سفیدی اُس اندھیری کوٹھڑی میں بھی سرائت کرتی تھی اور وہاں اُس کا من موہنا سُرخ و سفید چہرہ سوہنے مین نقشوں والا جگمگا رہا تھا.. ایسے روشن تھا کہ اُس پر نظر نہ ٹھہرتی تھی.. بقیہ دھڑ چادر میں روپوش تھا صرف چہرہ ظاہر ہو رہا تھا ایک سورج کی مانند.. حافظ جی ٹھٹک گئے اُس کے سوہنے پن کی تاب نہ لاسکے.. اُنہوں نے سر جھکا کر زیر لب دافعِ بلیات و جفات کے دم در دو پڑھے اور آنکھیں بند کر کے سر کو بائیں سے دائیں جانب جنبش کرتے اُس پر.. اُس کے چہرے پر پھونکیں مارنے لگے.. صاحبان کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگی.. اُن کے پاس دین کا جو تھوڑا بہت علم تھا وہ اُس کے حوالے سے اُسے سمجھاتے رہے کہ بھول چوک سے اگر شرک یا کفر کا کوئی کلمہ منہ سے نکل جائے تو صدقِ دل سے اُس کی معافی مانگنے سے وہ جو معاف کرنے والا ہے معاف کر دیتا ہے..

”حافظ جی.. اُس کی مرضی کے بغیر ایک ہاتھ بھی نہیں مل سکتا.. کیا یہ سچ ہے؟“

اُنہیں یکدم ایسے سوال کی توقع نہ تھی.. ”ہاں.. یہی سچ ہے..“

”تو مجھے اُس نے اپنی مرضی سے ایسا بنایا جان بوجھ کر.. تو کیا یہ بھی سچ ہے..“

وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے اور پھر قدرے توقف کے بعد نرمی سے بولے ”اُس کی مرضی کے سامنے ہم سب بے بس ہیں..“

تو وہ میرے لیے توجہ اور کریم نہ ہوا جو مجھے ایسا بنادیا.. اُس کی قہاری اور جباری مجھ پر تھی کیوں آرمائی گئی.. میرے باپ بختِ حیران پر کیوں نہ آزمائی گئی جس نے کلِ خدا کی پر زندگی تنگ کر دی تھی.. مجھ پر بھی کیوں حافظ جی..“ اُس کا وہ چہرہ جو ابھی جگمگا رہا تھا تارِ کیم میں ڈوبنے لگا..

حافظ جی اپنی پگڑی کے پلو سے اپنے منہ سے بولنے لگے ”اگرچہ میں اُن کے ایمان کو بھی متزلزل کر رہی تھی اور چلے گئے..“

شائد اُس کے اندر کڑواہٹ کا جو غبار تھا وہ حافظ جی کے اُن آنسوؤں سے قدرے دھل گیا جنہیں وہ اپنی پگڑی کے پلو سے پونچھتے اُٹھے تھے.. وہ جانتی تھی کہ دل ہی دل میں وہ بھی اُس کی حالتِ زار کے شاکِی تھے.. یہ آنسو اُنسی کا اظہار تھے.. بدن میں اُنشتی ٹپسیں قدرے مدھم ہو گئیں اور وہ ایک اونگھ میں چلی گئی..

”جی الفلاح.... جی!..“

اُس اونگھ کے اندر اُس نے سوچا کہ حافظ جی نے ابھی تو اذان دی تھی اب دوبارہ کیوں شروع ہو گئے ہیں اور پھر اُس کے حواس ذرا بیدار ہوئے اور اُسے احساس ہوا کہ باہر دو پہر ہو چکی ہے یہ عصر کی اذان تھی.. جو کچھ اُس نے کہا اگرچہ وہ سچ تھا پر کیا اُس کا اظہار ایسے سخت لہجے میں کرنا مناسب تھا.. حلاج کی مانند جو کچھ اُس نے کہا وہ بھی سچ تھا پر کہنا نہیں چاہیے تھا.. اور اس کہہ دینے کے لیے اگر صدقِ دل سے معافی مانگ لی جائے تو کیا حرج تھا.. اُسے یکدم ایک گیلیاہٹ کا احساس



نہلا دھلا کر اُس کے کپڑے بدلے تو وہ ایسے نکھر گئی ترو تازہ اور ستھری ہو گئی کہ اُسے صاحبان کو یقین ہو گیا کہ وہ اُس بھیا تک اور درد آمیز خواب سے جاگ گئی ہے جس میں وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں لتھڑی پڑی تھی اور اُس کے اعضاء کام نہ کرتے تھے ہاتھ پاؤں ٹپکتے تھے۔ درد کے تیر ہرٹو میں گھبٹے تھے۔ وہ تو ایسے نکھر گئی کہ اپنی ہم عمر میاروں کی مانند کد کڑے مارتی، قلائیں بھرتی اپنے باپ کی حویلی کا پچانگ پار کر کے باہر کی اُس دنیا میں سانس لے سکتی تھی جس میں اُس نے کبھی سانس نہ لیا تھا۔

”صاحبان۔۔ لے چلوں۔۔“

”بے بے۔۔ مجھے شیشہ تو دکھا دے۔۔ میں اپنے آپ کو دیکھوں تو سہی۔۔“

کنیز فاطمہ نے اچنبھے سے اپنی بیٹی کو آنکھوں میں پھونٹے لاڈ پیار کے جھرنوں سے دیکھا اُس نے ایسی فرمائش پہلے تو کبھی نہ کی تھی۔ بہت کھوج کے بعد ایک درازوں سے شکستہ آئینہ ملا جسے سامنے رکھ کر وہ اپنے بالوں میں خضاب لگاتی تھی۔ انگوٹھے اور چاروں انگلیوں کی گھنگھریلوں کو اس کے سامنے رکھتا تھا۔

اُس شکستہ آئینے میں جو اُس کی ماں کے ہاتھ میں لرز رہا تھا صاحبان نے اُس زندگی میں پہلی بار اپنی شکل دیکھی۔ جو اُس نے دیکھا اُس پر اسے اعتبار نہ آیا۔ اُسے اپنے اس چہرے کو پہلے دیکھ لینا چاہیے تھا کہ ایسے چہرے تلے اگر ایک کپڑا کھدوا کھدوا بدن ہو تو بھی یہ بیٹا اس قابل تھا کہ جیا جاسکے۔ وہ جمال ہیر کی تصویر تھی۔ اُس کے ماتھے پر خُسن کا مہتاب چمک رہا تھا۔ خُسن کا اُچھٹ حساب نہ تھا۔ چہرے سو بنے پر خند و خال ایسے بچتے تھے جیسے خوش خط حرف کتاب کا ہو۔ پر اُس چہرے تلے ہیر تھی ایک عفریت تھی اُس کا بیان کیا کرنا۔

کنیز فاطمہ کی آنکھیں اُس آئینے کو تھا سے ہوئے ساکت رکھنے کی کوشش میں ہارنے لگیں پر صاحبان اپنے آپ کو دیکھتی تھکتی تھی۔ دیکھے چلی جا رہی تھی اور مسکراتی چلی جا رہی تھی۔ مسکراہٹ میں بھی ایک میز حاین تھا۔ قدرے متکبر جیسا کہ بخت جہان کی گردن میں تھا۔ مسکراہٹ کونوں میں سے ماس کھینچتی تھی۔

وہ اُس شہزادے کی مانند تھی جس کے گل میں تمام آئینے توڑ دیئے گئے تھے تاکہ وہ اپنی شکل نہ دیکھ سکے اور جب وہ ایک گھنے جنگل میں پوشیدہ ایک تالاب کے پانیوں پر جھکتا ہے اور زندگی میں پہلی بار اپنی شکل کا عکس دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اپنی شکل سے نظریں نہیں ہٹاتا اور بالآخر جان دے دیتا ہے۔

”اب چلیں صاحبان۔۔“ اُس نے آئینہ پرے کیا تو صاحبان کی آنکھوں کے آگے نصیب کا اندھیرا چھا گیا۔

”ہاں بے بے۔۔“

کنیز فاطمہ نے بمشکل اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور کوٹھڑی کی جانب پہلا قدم اٹھایا تو صاحبان نے بھی بمشکل اپنا منہ کھاد بازو اٹھا کر اُس کے رخساروں پر رکھ دیا۔ ”بے بے مجھے اُس اندھے کنویں میں ابھی نہ لے جا۔ اُس چوکھٹ کے پار لے جا۔ جس کے پار میں آج تک نہیں گئی۔ جیسے میں نے آج حیاتی میں پہلی بار اپنے آپ کو دیکھا ہے ایسے میں اُس جہان کو بھی دیکھنا چاہتی ہوں جو اس چوکھٹ کے پار ہے۔“





انک کرم بھی پہنے بھی لگتا تھا اُس کے گرد چھ سات بطنیں کچھڑ میں کیزوں مکوزوں کی تلاش میں چونچیں مارتی قیں قیں کرتی اُس رُکے ہوئے سٹائے کو توڑتی تھیں۔ وہ اپنی چونچوں میں کچھڑ بھر کر گرد میں آسمان کی جانب کرتیں اور پھر چونچوں کے دونوں جانب کے سوراخوں میں سے وہ کچھڑ بہہ جاتا اور اُس میں جو کھڑے مکوڑے پرورش پاتے تھے وہ اُن کی گردنوں کے راستے پیٹ میں اُتر جاتے تھے۔

یہ اُس کی زندگی کی پہلی زندہ بطنیں تھیں۔

وہ اُن بطنوں سے کتنی مختلف تھیں جن کی تصویریں اُس نے قاعدوں اور کہانیوں کی کتابوں میں دیکھی تھیں۔ اور کیا وہ تمام پرندے اور جانور بھی اتنے ہی مختلف ہوں گے جنہیں وہ محض تصویروں کے توسط سے پہچانتی تھی۔ کبھی کبھار جب سرشام مویشی گھروں کو لوٹتے تھے تو اُس نے صحن میں پڑے اُن کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ بھینسوں کی تصویریں سچ سچ کی بھینسوں سے کہیں بہتر تھیں۔ پر یہ بطنیں جو پھڑ پھڑاتی گندی نالی میں چونچیں ڈالے لٹل کرتی تھیں یہ تو ایک عجوبہ تھیں۔ ان کی آنکھیں سیاہ موتوں کی سی تھیں جو اُن کی سیڑھی میں چڑھتے ہوئے تھے۔ تو پھر اُن سارے پرندوں اور جانوروں کو دیکھنا۔ اپنی آنکھوں سے۔ زندہ دیکھنا کیسا ہوگا جنہیں وہ تصویروں میں دیکھتی آئی تھی۔ پر اُن سب کو دیکھنے کے لیے تو دنیا کو دیکھنا ہوگا۔ اور دنیا کو دیکھنے کے لیے ایک متحرک اور صحت مند بدن درکار ہوتا ہے۔ اُس کا چہرہ جس کے اندر ایک متحرک دماغ تھا اپنے ناکارہ اور نیم مرده بدن کو ترک کر کے اُس دنیا میں تو نہیں جاسکتا تھا۔ وہ سب کے سب پرندے اُن کے دماغ سے تھے۔ وہ سارے پرندے اُن کے دماغ میں تھے۔

UrduPhoto.com

یہ اس امر سے آگاہ ہو چکی تھی کہ اُس جیسے بدن والے لوگوں کی حیات مختصر ہوتی ہے۔ وہ دیر نہیں جیتے۔ اور اس کے باوجود حیات انہیں اتنی سی سہولت بھی عطا نہیں کرتا کہ وہ مرنے سے پہلے سارے پرندے اور جانور اپنی آنکھوں سے زندہ حالت میں دیکھ لیں۔ وہ قادر تو ہے مگر عادل نہیں ہے۔ باوجود رزن کے کچے کھٹکے کے دیہڑے میں سے اُپلوں کا سلگتا ہوا دھواں سفید ہو کر دو پہر کی دُکھ میں اُلتا ہوتا تھا۔

وہ جو ابھی جینے کی تمنا ہی ہو رہی تھی محض چند بطنیں دیکھ کر مرنے کی آرزو کرنے لگی کہ ایسی بے کاڑ بے حس اور بے حرکت حیات کس کام کی جس میں دنیا نہ دیکھی جائے اور اُس کے آسمانوں پر اڑتے اور جنگلوں میں کوکھتے اور جھاڑیوں میں بھدکتے اور تالابوں میں تیرتے کچھ دیکھیں۔ نہ دیکھے جاسکیں۔

اگرچہ وہاں ایک زکا ہوا انسان سٹائے تھا۔ کوئی بندہ بشر نہ تھا صرف چند بطنیں تھیں پر وہاں اچھو شیخ تھا۔ وہ اُس دو پہر بھی کوڑے کرکٹ کی گندگی کی ڈھیر پر اطمینان سے براجمان کا لُچ کے ایک نوکیلے تیز دھار کھڑے کو نہایت دل جمعی اور دھیان سے اپنی گردن پر جہاں شرگ اُبھرتی ہے وہاں پھیر رہا تھا اور اُس پر تازہ خون کی بوندیں گرتی تھیں۔

صاحبان نے جب اُن بطنوں کے سحر سے اپنی نگاہوں کو آزا کیا اور ادھر شیخوں کے محلے کی جانب نظر کی تو وہاں بڑھاپے کی دلیلیں پر قدم رکھتا اچھو شیخ تھا جو ہولے ہولے اپنی گردن کو کا لُچ کے ایک کھڑے سے کانٹے کے پُرسرت مشغلے میں مشغول تھا۔

ساحباں کی نظر اُس پر گئی تو وہیں ٹھہری رہی۔ اُس کی ماں محلہ مغربی کے ہرکین کے بارے میں اُسے نہایت تحصیل سے بتاتی رہتی تھی اور اُن میں اچھو شیخ کا کردار بھی تھا جو ہمہ وقت خود کٹی پر آمادہ رہتا تھا، کوڑے کے ڈھیروں میں سے شیشے کے گھرے تلاش کر کے انہیں اپنی گردن پر تب تک بھیرتا رہتا تھا جب تک کہ اُس میں سے نکلنے والے خون کی لپکتی سے یا تو وہ بے ہوش ہو جاتا اور یا پھر اُس کی ماں دوپائی دیتی ہوئی اُسے اپنے کپچے سے لگا کر واپس گھر لے جاتی۔

بچوں کے بعد وہ پہلا ذی روح تھا جسے وہ سچ سچ دیکھ رہی تھی اُس کے چہرے کا کھنکار جو اُس کے نہلائے جانے پر کھنکھاتا تھا اچھو شیخ کو یوں مشغول دیکھ کر ٹھہرانے لگا۔ شاید اُسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ سارے کے سارے پرندے اور جانور اُن دیکھے رہ جاتے ہیں اس لیے اس بے کار حیات کا کیا فائدہ۔ کیوں نہ اسے کالچ کے ایک گھڑے سے کھرچ کھرچ کر خون آلود کر دیا جائے اور اس سے نجات حاصل کر لی جائے۔

اچھو شیخ اُس کی جانب کب دیکھتا تھا وہ تو اپنے فرض کی ادائیگی میں مگن اپنے لبو کی بوندوں کو دیکھ کر پڑھن سرت

ہوتا تھا۔

پر جب وہ اپنے ہاتھ سے پسینہ پونچھنے کی خاطر ذرا دم لینے کے لیے رُکا تو اُسے بخت جہان کی چوکھٹ کے آگے بھی میں پڑی چلا پانی پر ساحباں نظر آ گئی جو ٹنگی باندھے اُس کی جانب دیکھے چلی جا رہی تھی۔

”راہی، ساحباں نے اُسے پکارا۔“

UrduPhoto.com

اُسے آج تک کسی نے اتنی قربت سے ”بھراہی“ کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ بے شک اُس کے دلخیز کو اذیت اور درد کے سندیے سے پانچنے والی شریانیں مردہ ہو چکی تھیں پر وہاں کوئی ایک شریان ایسی تھی جو صحت کے لٹکارے وصول کر سکتی

”جی بہن جی۔“

”میں بخت جہان کی بیٹی ہوں ساحباں، پہلی بار چوکھٹ سے باہر آئی ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ ترے

سے آسکوں۔ تم آ جاؤ بھراہی۔“

اچھو شیخ اُس کا ٹھکڑا کپڑے کے ڈھیر سے اٹھ کر خون آلود کالچ کا ٹکڑا سینے سے لگائے اُس کے قریب آ گیا۔ ”جی

سک جی۔“ اُس کی گردن کے گھاؤ سے خون رستا تھا۔

”بھراہی، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟“

”میں۔۔ اُس کے ہونٹوں کے کناروں سے رال بہنے لگی۔ ”کیا ایسا کیوں کرتا ہوں؟“

”کالچ کے گھڑے سے اپنا گلا کاٹتے ہو تمہیں درد نہیں ہوتی؟“

”درد؟ وہ کیا ہے؟“

”جو مجھے مسلسل دن رات اُس اندھے کنویں میں ہوتا ہے۔“

ابھی تک پورے محلہ مغربی میں دوپہر کی ویرانی تھی۔ بابو درزن کے ویڑے میں سے اٹھنے والے دھویں کے سوا



زندگی کے کچھ آثار نہ تھے۔

اجتوش بہت چھپتا یا کہ میں اپنی محفوظ آماجگاہ اُس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ایک روہڑی سے اٹھ کر یہاں کیوں آ گیا اور تب صاحبان نے اُس سے ایک سوال کیا ”ایک درخواست گزاری۔“ بھراتی۔ میرا ایک کام کرو۔ اگر میں نے اس جہان کے سارے پتکے پھیرا اور جانور نہیں دیکھنے تو میرا ایک کام کرو۔“ اُس کا ماہتاب چہرہ اور سوتیلی بہن شکل مرہارہی تھی ”میرے قریب آ جاؤ اور یہ سمجھو کہ میری گردن تمہاری ہے اور تم اس پر اپنا خون آلود کالج کا کلڑا تب تک پھیرتے رہو جب تک کہ میرا ذہن میرے بقیہ دھڑکی مانند مردہ نہیں ہو جاتا۔“

”نہیں۔“ وہ یکدم ذرا تشدد پسند ہو گیا ”گردن اپنی اپنی۔“ اور اُس نے وہ خون آلود کالج کا کلڑا اصحابان کے سپرد کر دیا۔ ”میں روہڑی میں سے کوئی اور شے کا ٹکڑا تلاش کر لوں گا۔“ اور سر ہلاتا کچھ گنگنا تا واپس چلا گیا۔

نوٹے ہوئے شے کے ٹکڑے کی تیکھی نوکیں بھی خون سے بھری تھیں۔ صاحبان نے اُسے بمشکل اپنی بے جان انگلیوں میں تھاما۔ ابھی یہ اُس کی حیات کا سب سے بد بخت اور خون کا۔ اُس نے پہلی بار ایک شکست آئینے میں اپنا روپ دیکھا تھا۔ چوکھٹ کے باہر کے جہان میں سانس لیا تھا اور بطنیں دیکھی تھیں جو زندہ تھیں اور نہ تھیں۔ نادیدہ پرندوں اور ان دیکھے جانوروں کا دنیا سے بد بخت کرنا اس حیات کو اپنے ہاتھوں سے فنا کر دینے کا فیصلہ کرتا تھا۔

اُس نے گردن سیدھی کر کے اُس شے کے ٹکڑے کو رگ جاں کے قریب آ کر ذرا سا رگڑا۔ تو جو نمی ماس میں سے پہلی خوراک لایا۔ وہ خون کی تیکھی توڑ۔ اُس نے اس کو سانس لیا اور بطنیں دیکھی تھیں جو زندہ تھیں اور نہ تھیں۔ نادیدہ پرندوں اور ان دیکھے جانوروں کا دنیا سے بد بخت کرنا اس حیات کو اپنے ہاتھوں سے فنا کر دینے کا فیصلہ کرتا تھا۔

”بے بے۔“ وہ نے شہم مردہ بازوؤں کو بلند کرنے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔ اُس نے اپنی گردن خو سے نہیں کاٹ سکتی۔ بہت درد ہوتی ہے تو میری مدد کرنا۔ اُس نے کچھ دیر بعد اُس کو سانس لیا اور بطنیں دیکھی تھیں جو زندہ تھیں اور نہ تھیں۔ نادیدہ پرندوں اور ان دیکھے جانوروں کا دنیا سے بد بخت کرنا اس حیات کو اپنے ہاتھوں سے فنا کر دینے کا فیصلہ کرتا تھا۔

اُن کو نہ دیکھ سکوں گی۔ مجھے مار ڈال۔ مائے!۔“

غم دیئے مستقل۔ اتنا ٹاک ہے دل۔ یہ نہ جانا۔



صحن سونا ہو چکا تھا۔

اُس کی درجنوں چہیتی سونہی سہانی اور من موہنی مرغیوں کے بعد وہ بانکا چھیلا صاحب بہادر بھی رخصت ہو چکا تھا۔ تو وہ خود رخصت کر کے آئی تھی۔ چاہے بخت جہان کی کوئی کوئی میں ڈال دیتی تھی۔ وہ میزے پر دھریک کے زرد رنگ کا سرسرا تا فرش بچھا تھا اور وہ کیسی شان سے اُس میں کھڑا اپنی گردن ڈھکنے نہ دیتا تھا۔

آپاں مابلو بھی جب آج سے پینتیس برس پیشتر ڈولی میں رخصت ہوئی تھی تو صاحب بہادر بھی طرح مرنے کے لیے رخصت ہوئی تھی۔ اس چوکھٹ پر سے اُس کا جنازہ گزرا تھا۔

دھریک پر آئے ایک عرصے کے بعد آپاں مابلو کی شکل بھی جو لکھن میں کھیتی ہوئی جب اپنی سسھیوں سے چھٹی مٹی کے گولے میں روپوش ہو جاتی تھی تو وہ مٹی اُس کی شکل کے سونے پن کے نور سے جگمگانے لگتی تھی اور وہ کھو جاتی تھی۔

چاہے بخت جہان کھسکا میزے کی جانب سے ابھی ابھی ایک دل خروش چیخ نکلتی تھی جو اُس کی کپلے ہوئے بدن والی اپانج بینی صاحبان کی لگتی تھی۔ اگرچہ وہ اُس کی بھی چھوڑ چکی تھی۔ آج تک اُسے دیکھا نہ تھا۔ اور جن چند لوگوں نے اُسے دیکھا تھا اُن کا کہنا تھا کہ اُس کا چہرہ مابلو کے حُسن والا تھا۔ اور مابلو بھی زندہ نہیں رہتی اُس کی آسمانوں سے بھرتی ہوئی پیچک کی رستی پورے جوہن میں تنگ جاتی ہے۔

آپاں مابلو اُس کی یادوں کے صحن میں جھاٹھیریں پھنکاتی چلی آئی۔

ساوَن بھادوں کا دم روکنے والا جس ساکت تھا۔ گاؤں پر "معلق" ٹھہرا ہوا تھا۔ ہر شے.. کیا جاندار گیا بے جان رہ گیا۔ انسان کیا حیوان کیا منہ کھولے ہانپتے تھے۔

کروڑ یا ساپ بھی شکر یزوں والے ویرانے میں جس کا مارا زبان سرسرا تا بلبل سے باہر اپنا کھوتا سر زمین پر کھے کھے ہوا ہو رہا تھا۔ اور وہ ایک نیولا جو کروڑ نیے کی جان کا بیری تھا اُس کا سردانتوں میں دبوچ کر اُسے کچل دینے کی آواز دیکھ کر عرصے سے رکھتا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ کروڑ یا دو چار قدم کے فاصلے پر اپنے بل سے باہر سر کھے بے جان پڑا ہے۔ پھر بھی اُس کی جانب نہیں بڑھتا تھا کہ اُس کی ٹانگوں میں سے بھی جان جیسے کھینچ لی گئی ہو۔ جس نے اُسے بھی بے حال کر

رکھا تھا۔ جو ہڑکی تہہ میں پوشیدہ کچھوے اپنے چپہ نما پیر چلاتے کچھڑے پانیوں کو گدلا کرتے سطح آب میں سے اپنی گردنیں نکال کر اپنا منہ کھول دیتے اور وہاں بھی اُن کے لیے ہوا کا ایک سانس نہ ہوتا اور وہ پھر سے چپہ چلاتے تہہ میں اتر کر کچھڑ میں روپوش ہو کر باہنہ لگتے۔

چھپکلیاں شہتروں اور کچی دیواروں کے ساتھ چھٹی اپنے آپ کو اوندھا ہو جانے سے بمشکل بچاتی تھیں۔  
مینڈکوں کی آنکھیں جو ہڑکی سطح پر ساکت پڑی تھیں۔

نواری چار پانی پر کروٹیں بدلتی اُس کی وائل کی قمیض بدن میں سے چھوٹنے والے پسینے میں بھیگی ہوئی ایک درزی کی مانند اُس کے نشیب و فراز کا ناپ لیتی تھی اور اُس کا بھی دمڑا تھا۔  
چار پانی کی سفید نواری بھی اُس کے پسینے سے نچڑنے کو آتی تھی۔

یہ وہی دن تھے جن کے بارے میں کہات ہے کہ ان دنوں میں جس کے مارے جاٹ بھی فقیر ہو جاتا ہے۔  
کیوں ہو جاتا ہے یہ تو صوبت وہی جانتے ہیں جو ان موسموں میں گئے گئے کھیت میں ٹم ہو کر اُس کی کوڑی کرتے ہوں۔

”بے بے۔۔“ مابلو نے وائل کی نچڑتی ہوئی قمیض کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پسینے میں پسٹی ہوئی کول چھاتیوں کو پونچھا اور صدادی ”میرا ساہ بند ہونے لگا ہے۔ میں خورشیدال دہلی کے ساتھ دے میں چھٹ ٹھٹھنے کے لیے چلی جاؤں؟“

”جی۔۔“ پیار کے کچے فرش پر بے سندھ پڑی بہشت بی بی بلی بلی سے اپنے آپ کو تیزی سے مصلحتی تھی پر مجال ہے کہ ہوا کا کوئی ٹکڑا اُس کے پسینہ آلود چہرے کو چھوتا ہو۔

بے بے پہلے تو ایسی تھکتی کبھی انکار نہ کرتی تھی۔ پچھلے دو تین ماہ سے کچھ نیا دہلی ڈا ہڈی اور سخت گیر ہو گئی تھی۔  
چوکھٹ کے پار قدم دھرتی ہوں تو ڈانٹ دیتی ہے کہ مابلو پاؤں اٹھا کر اندر کر کے ورنہ اسے کاٹ دوں گی۔ نہ سہیلیوں کے ساتھ لگن مٹی کھیلنے دیتی ہے اور نہ ہی ٹھو لاجھولنے کی اجازت دیتی ہے۔ تو کیوں اتنی سخت گیر ہو گئی ہے۔

بہشت بی بی کے پاس ان پابندیوں کا مناسب جواز تھا۔  
تین ماہ پیشتر مابلو کو کپڑے آگئے تھے۔ وہ تب سے دن رات اُس کی حفاظت کرتی اُس پر نظر رکھتی تھی۔  
”بے بے۔۔“ اُس نے پھر فریاد کی۔ ”مجھے سانس نہیں آ رہا۔“

پر اُس جس آلودہ و پہر میں بہشت بی بی لہجہ گئی۔ نرم پڑ گئی۔ ایسی دم روکنے والی دو پہر میں یہ امکان ہی نہ تھا کہ کوئی اُس کی بیٹی پر نظر ڈالے۔ کسی کا سانس چلتا ہوگا تو وہ نظر ڈالے گا ”چل دفع ہو جا۔ پر خورشیدال لوہاری کے بغیر دارے میں پیگٹ ٹھلانے کے لیے نہ جانا۔“

مابلو ایک جال میں پھنسی ہوئی ہرنی کی مانند کدڑا مار کر اپنی بھیگی ہوئی نواری چار پانی سے اٹھی پاؤں میں جوتیاں اڑھیں اور دم سے پیار میں وارو ہو کر بہشت بی بی کے سامنے آکھڑی ہوئی ”سچ سچ ہے بے۔۔“  
”دفع ہو۔۔“



صحن میں دھڑک کا نوجوان بونا بھی دم سادھے کھڑا تھا...

چمکت پار کرتے ہوئے اُسے اُس کے اندر سے شیشم کے پتوں کی تالیوں کی مدھم سی آواز آئی..

باہر کی اتنی ویران تھی کہ تالی کے کچھڑ کو چونچوں میں بھر کر اس میں سے کیڑے مکوڑے کشید کرنے والی بطنیں بھی

سجھتی تھیں۔

شوکی لوہار کی کوٹھڑی کے باہر کھڑے ہو کر مابلو نے خورشیداں کو گرشیداں کہہ کر متعدد بار پکارا تو اندر سے کوئی

جواب نہ آیا۔ صحن کھانی جانے کہاں مر گئی ہے.. کچھ دیر بعد شوکی لوہار آنکھیں ملتا باہر آیا اور مابلو کو اُس ویران گلی میں اپنی

تنگیوں میں جھٹی ہوئی دیکھ کر چونکہ وہ ساری کی ساری ظاہر ہو رہی تھی 'سششش' رہ گیا۔ اور پھر اُس نے اپنے آپ کو بہت

صحن کیا کہ یہ تمہاری بیٹی کے برابر ہے کچھ حیا کرو.. وہ نظریں نیچی کر کے بولا 'گرشیداں تو اپنے مامے کے ساتھ چلی گئی

بھلا آج شام آ جائے گی..'

ہاشک مابلو نے بے بے ہو کر کہا تھا کہ گرشیداں میں سے کسی بھی عورت کو میں نہیں جانے گی پر اگر گرشیداں اپنے

ماتے کے پاس چلی گئی تھی تو میں اُس کا تو کچھ قصور نہ تھا۔

جانوں کے دارے یا جو پال کے صحن میں شیشم کے بلند اور گھنے شجر کی شبینوں سے بندھا بیٹھتا بھی جس کا مارا ہوا

پتہ نہ تھا۔ اُس کی ریشی پت سن سے گزر جی ہوئی نہ! پتھر کی ہو۔

UrduPhoto.com

وہ بھٹ سمٹا کر اپنی ٹھیکس ہوئی پشت لوجھ لے لے کے پوئی تختے پر بٹا کر ہو لے ہو لے اسے جھلا لے گی..

دار کے کنارے پر جو جو ہڑ اس سلتی گری اور جس میں بمشکل سانس لیتا تھا اور جس کی سن آب پر متعدد

سجھان کی شہم مردہ آنکھیں مڑی تھیں اور اُس کے پار جو قبرستان تھا جس میں مابلو کے آباؤ اجداد کی قبریں تھیں تو وہ کیسے

جان سکتی تھی کہ ان کے برابر میں اتنی جھلکی ہوگی اور وہ جھلکا جھلکا ہوگا۔ سنسنی سے بھیسے ہوئے بدن کے زور سے جھلکی

شیشم کے شجر کے سب سے بلند آسمان کی قربت میں جس میں جھمکے ہوئے پتوں کو اپنی ناک سے چھونے لگی۔

اُس کے بدن میں سے پھٹکتے پیسے کے قطرے پڑی پر جہاں جہاں گرتے وہاں سے پھل جھڑیاں اور انار پھوٹنے

تھیں۔

کوٹ مراد کا چوہدری امام بخش اپنے ماں باپ کا اکھوتا تھا.. مراد بخش اُس کا دادا تھا جس نے ایک ویرانے میں

نئے حشمت کا خون پیسہ بھا کر اُسے آباد کر لیا تھا اور اُس کے ذریعے کے گرد وہ بستی وجود میں آئی جسے کوٹ مراد پکارا جاتا

تھا۔ مراد بخش اُس کا اکھوتا پوتا ساری زمینوں کا تہاوار لے لے گا۔ وہ ابھی سولہ برس کا نہ ہوا تھا جب اُس کی ماں نے اپنی سگی بیٹی

حیات بی بی کے ساتھ اُسے بیاہ دیا تھا تا کہ ان زمینوں میں اُس کے میکے والے بھی شریک ہو جائیں.. وہ اُس کی ماں کی سگی

بیٹی اُس سے پورے سات برس بڑی تھی 'صورت شکل میں بھی ایسی تھی کہ امام بخش کے برابر میں جتنی نہ تھی کہ وہ ایک جھلا

گھسے پٹے رنگ کا دروازہ قامت والا ایسا جوان تھا جس کی مونچھیں اتنی بھوری تھیں کہ سنہری دکھائی پڑتی تھیں اُس کی

مسکراہٹ میں کوئی ایسا سحر تھا کہ وہ جس کی جانب دیکھ کر مسکرا دیتا وہ اُس کا اسیر ہو جاتا.. وہ ایک انتہائی شریف انسان صابر شا کر اور مطیع شخص تھا۔ حیات بی بی کے ساتھ بخوشی گزارہ کرتا رہا..

حیات بی بی اُسے اپنے تین بچوں سے بڑھ کر چاہتی تھی اور اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی اُس کے آگے پیچھے پھرتی تھی..

اُس روز چوہدری امام بخش تحصیل ہیڈ کوارٹر میں ایک تاریخ بھگت کر کوٹ مراد واپس جا رہا تھا اور اُس کی گھوڑی کے آگے پیچھے دو میراثی اور تین جولاہے چلتے تھے اور جس اتنا تھا کہ وہ پسینے کی وجہ سے بار بار کانٹھی پر سے پھسلتا تھا اور گھوڑی کے تھنہ سانس کھینچنے کی سعی میں پھول کر رہا ہو رہے تھے اور وہ بار بار ٹھوکریں کھاتی تھی.. وہ راستے میں پڑتے دنیا پور کے اندر نہیں گئے بلکہ اُس سے پرے جو ہڑ کے کناروں پر سے ہوتے ہوئے کوٹ مراد جا رہے تھے جب چوہدری امام بخش نے اُس جو ہڑ کے پار جانوں کے کچے دارے کے صحن میں سے اٹھتی ایک پیگ کو دور سے دیکھا..

اور اُس پیگ کو ٹھوٹی مابلو کہہ لیا..  
پیگ ایک قوس کی شکل میں بنا رہا جی تو اپنے پیچھے ایک روشن کہکشاں چمک رہی تھی.. امام بخش کا دل رُک گیا.. اُس کے رکنے سے اُس کی گھوڑی رُک گئی اور اُس کے ہمراہ دونوں میراثی اور تینوں جولاہے رُک گئے..

رشتہ لے کر میراثی اور تین جولاہے صاف اٹک کر رہ گئے..  
رشتہ لے کر میراثی اور تین جولاہے صاف اٹک کر رہ گئے..  
رشتہ لے کر میراثی اور تین جولاہے صاف اٹک کر رہ گئے..

ہم محنت محنت سے مختصر زمینوں پر گزارہ کرنے والے جاٹ ہیں اور کوٹ مراد والے ہم سے زیادہ حیثیت والے ہیں.. ہمارا اُن کا کوئی میل نہ تھا اور پھر جو میراثی پہلے سے شادی کر چکے تھے وہ تین بچوں والا ہے تو برادری کیا کہے گی کہ محمد جہان نے زمینوں کے لالچ میں اپنی بیٹی ایک سو کن پر بیواہ دی..

یہ تو نہیں کہ چوہدری امام بخش ایک ذہنی عمر کا خطاب سے بال کا لے سیاہ کیے ہوئے ایک بڑے ہوش شخص تھا وہ تو ابھی تیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا لیکن شریکوں نے تو یہی کہنا تھا کہ نمبر دار نے اپنی بیٹی کا خسن فروخت کر دیا..

تو معاملہ یہیں ختم ہو گیا.. میرا شن نامراد لدوؤں سے بھرا ہوا اقبال سر پر رکھ کر چلی گئی پر امام بخش کے اندر مابلو کے عشق نے ایسے ڈیرے جمائے کہ وہ سودا کی سا ہو گیا.. کنویں کے گرد مومیشیوں کے جو کچے کوٹھے تھے وہیں سو رہتا گھرنہ جاتا دنوں میں لاغر ہو گیا.. جس روز میرا شن چوہدری کا رشتہ لے کر آئی تھی اُس کے پورے بیس دن بعد جب مابلو ایک سو رہ بیدار ہوئی تو صحن میں دو دھڑ رُکھتی اپنی نمبر دارنی ماں کے ٹھکنے سے لگ کر بولی ”بے بے.. میری بات غور سے سُن.. میں نے کچھیلی رات خواب میں دیکھا ہے کہ عرشوں پر میرا نکاح چوہدری امام بخش سے ہو گیا ہے.. تو پاؤں کر دے..“

بہشت بی بی کی چانی میں مدھانی کے مسلسل ٹھونسنے سے جو دودھ نکھن اور کچی لسی میں بدلنے کو تھا اور تلام میں تھا وہ یکدم سا گت ہو گیا ”مابلو کچھ ہوش کر.. یہ تو کیا کہہ رہی ہے..“

”بے بات تو جانتی ہے کہ میں جھوٹ بولنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں دین ایمان سے بچ کر رہی ہوں۔“

عشق پرانہ بخش کے ساتھ میرا نکاح ہو گیا ہے اور اب میں اُس کی منکوحہ ہوں۔“

بہشت بی بی سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اس پر اور راست خدائی قسم اور مداخلت سے لرز گئی۔

اُس روز محمد جہان نسر دار کا خاندانی میراثی کوٹ مراد چار ہا تھا۔ چوہدری امام بخش کو اطلاع کرنے کے ہمیں یہ رشتہ

حجبہ

یہ آج تک نہیں کھلا کہ کیا واقعی ماہلو نے ایک خواب میں عرشوں پر اپنا نکاح چوہدری امام بخش سے ہوتا دیکھا تھا یا نہیں۔ یہ سب کچھ گھڑا تھا کہ اُس ناویدہ محبوب کا سودائی پن اُس میں بھی سرائت کر گیا تھا اور وہ بھی اُس کے عشق میں گھر ہو گئی تھی۔ امام بخش کی شکل اور بصورتی مونیچھوں کی بھی بڑی دھوم تھی وہ جب گھوڑی پر سوار کسی گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتا تو کنواریاں کواڑوں سے لگی آسے چھپ چھپ کر ہر کچھتک سے لڑنے لگتی تھیں۔ اور اگر ایسا سوہنا تمہیں جھولا جھولے دیکھ کر مرے خاکبے بن جائے تمہارا ہاتھ مانگ لے اور صرف حیثیت کم ہوئے جسکے باعث اور بیوی بچوں کی وجہ سے اسے گوراکھ ہو جائے تو یہ بھی عین ممکن تھا کہ اُسے حاصل کرنے کی خاطر ایک خواب بن لیا جائے۔ خواہش کی مٹی کو پتیل کے چاک پر چڑھا کر آرزو کا کوزہ تخلیق کر لیا جائے۔

UrduPhoto.com

ماہلو بے شک اس شب اپنی نواری چار پائی پر بنا کی خیال اور چاہت کے بے خبر سوئی تھی پر حقیقت ہے کہ اُس کا وجود عرشوں تک جا پہنچا تھا جہاں امام بخش سہرا باندھے اُس کا منتظر تھا۔

اُدھر بخت جہان و فتنوں کی تیسری گولی نکلنے کے بعد چار پائی کا پایہ تمام کراہنے آج پہنچا تو کام رکھنے کی کوشش میں بے حد مسکراتا جاتا تھا اُسے خبر کی تھی کہ جہان و فتنوں کی جانب سے کیا ہو رہا ہے اور وہ کڑیا ہے کہ اُسے امام بخش کا رشتہ قبول ہے تو اُس کا نشر سارے کا سارا غرق ہو گیا احمد سے راکھ ہو گیا کہ وہ چوہدری جس کی گھوڑی کے ٹسموں تلے سے اُس کی جیس ٹھم نہ ہوتی تھیں وہ محمد جہان کا داماد ہو جائے۔ اُس نے سر جھٹک کر اپنے گردن تک آئے ہوئے ہالوں کو سنوارا اور سبھی مرد و زن ڈانگ پکڑ کر جوہلی سے باہر آ گیا۔

”اوئے محمد جہان۔“ وہ اُس کی چوکھٹ کے قریب جا کر بند دروازے پر اپنی ڈانگ کھڑکا کر بولا۔ اور ہاں یہ وہی چوکھٹ تھی جس کے باہر اُس نے آج سے برسوں بعد آنے والے بدل چکے زمانوں میں ایک مرنے والے مُرخ کے حوصلے کے لیے ہاتھ پھیلائے تھے۔ کچھ تو شرم کر۔۔۔ تجھے خاندان کی عزت کا کچھ پاس نہیں۔ میری سگی بہن کی کا ماہلو کا سودا کر لیا ہے۔ بچہ بچہ ہی تھی تو مجھے کہتا میں کسی راجے مہاراجے سے سودا کروا کے مہنگے داموں فروخت کر دیتا۔“

کچھ عرصے سے اُس کے بچے کو ایک عجیب دکھتی سلقی حدت نے اسیر کر کے چار پائی پر ڈال دیا تھا۔ دو ادارو بہت سے پر اُس کا یہ دم بخور اُس کے بدن میں رچ گیا تھا دن بدن کم ہوتی جاتی تھی۔ نفاہت کی اُس بے بسی میں اُس کے کانوں پر اُس کے چھوٹے بھائی کی آواز دستک دیتی تھی۔ بچہ بچہ ہی تھی تو مجھے کہتا میں کسی راجے مہاراجے سے سودا



کرادیتا۔

”ہیشیاں۔“

وہ تو پاس ہی پائے کے ساتھ گئی تھی ”ہاں محمد جہان۔“

”تو سن رہی ہے کہ جہانناں کیا وادی جاہی بک رہا ہے گلی میں کھڑا ہو کر۔۔۔ سارا محلہ سن رہا ہے۔“

”ہاں۔“

”تو اُس بے دید کا منہ بند کر۔۔۔ مجھ سے تو اٹھا نہیں جا رہا۔“

”میں جاتا ہوں چاچا۔“ اُس کا اکلوتا بیٹا عزیز جہان اگرچہ دل ہی دل میں اس چاچے کی دہشت سے لرزتا تھا پر

اُس میں جو آبائی عزت نفس تھی سر اٹھاتی تھی۔

”نہیں پتر۔“ محمد جہان نقاہت سے مسکرایا ”ابھی تیرا وقت نہیں۔۔۔ ہیشیاں اٹھ۔“ نور بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگرچہ وہ ابھی ایک بالڑی سی تھی پر اُس میں انکھ اٹتی تھی کہ وہ بے پناہ ایک بارے سے بھر سکتی تھی جس نے اُن کی حیاتی کو

عذاب بنا رکھا تھا۔ ”چاچا میں باقی ہوں۔ آپاں کے بارے میں باتیں کرنے والے کا میں تو قہقہے دوں گی۔“

اور ماہلوں کے کونے میں بیٹھی خواہش کرتی تھی کہ کاش وہ عرشوں تک نہ پہنچی ہوتی۔

”نہیں پتر۔۔۔ بہشت تو اٹھ۔“

بہشت لی نے اُترتی شام کی سیاہی کو زائل کر کے چاندنی کے تہہ صبر کو آئینہ دار کر آئے روشن کیا اور طاق میں سے سب کو اُٹھائی میں جاتی ہوں۔

پھر وحلی شام میں بخت جہان بھولتا تھا۔

اپنی ڈانٹ کے مہارے اپنے آپ کو قائم رکھنے کی سعی کرتا تھا پر انہوں کی تہہ صبر کوئی اُسے نچوٹے پر آمادہ

کر لیتی تھی۔

”جہانیاں۔“

وہ اس مخاطب سے اپنی جھوم سے فوراً باہر آ کر قائم ہو گیا۔ کہ وہ اس بھر جانی سے بے حد خائف تھا۔ اُس کا قیاس

تھا کہ محمد جہان غضب ناک ہو کر باہر آئے گا تو وہ اُسے خوب لعن طعن کرے گا۔۔۔ پر وہاں بھر جانی اُس چوکھٹ کو تھا جسے اُس پر

گرج رہی تھی ”تو کیسا بے حیا ہے جہانیاں اپنی سگی بھتیجی کے بارے میں وادی جاہی بک رہا ہے۔ تجھے تو کچھ حساب ہی نہیں کہ

تیری کتنی بیٹیاں ہیں اور کہاں ہیں۔ تو جا اور اُن کے سووے راجوں مہاراجوں سے کر لے۔“

”بھر جانی۔“ وہ بھڑکتی آتش سے یکدم موم ہو کر راکھ ہو گیا ”ماہلو میری بیٹی ایک ایسے گھر میں جائے جہاں ایک

سوکن اور اُس کے بچے موجود ہوں مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”تجھے بیٹیوں کے علاوہ کیا اپنی بیویوں کا کچھ حساب ہے جہانیاں۔ تیری اور تمہارے دادے کی متعدد بیویاں

نہیں تھیں تو اگر ہم نے صرف ایک بیوی کی موجودگی میں ماہلو کا رشتہ قبول کر لیا ہے تو کونسا ظلم کمایا ہے۔ پوری برادری نے

تیری یادہ گوئی سن لی ہے تو اب خوش ہے؟ دفع ہو جا یہاں سے۔۔۔ تجھے پتہ ہے کہ میں فیروز والے کے بڑے جانوں کی بیٹی

میں ہر قسم کے دنیا پوروں کی مانند بے غیرت نہیں ہوتے۔ چلا جا بے غیرت۔“  
 بخت جہان کا قد و قامت شرمندگی اور خجالت سے مختصر ہو گیا اور وہ کچھ کہے بغیر سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ واپس  
 جا کر اس نے دودھ کے ساتھ افیون کی اکٹھی مزید دو گولیاں حلق میں اتاریں اور پھر ایک گہری انگلی میں چلا گیا۔

ماہلو اور چوہدری امام بخش کے بیاہ کی بہت دھوم مچی۔ بڑے چرچے ہوئے۔ بہت تذکرے ہوئے۔  
 ویسے اُس بیاہ میں وہ کچھ نہ ہوا جس سے دھومیں مچ جاتی ہیں۔ نہ تو سنگتوں کی تعداد میں دیکھیں اُتریں پلاؤ  
 نہ دے اور گوشت کی۔ نہ ہی کمی کیوں نہ ہو کھواب کے جوڑے دیئے گئے۔ نہ ہی ٹوٹریاں یا شہنائیاں بجائی گئیں۔ رواج تو  
 یہی تھا کہ آمد بارات پر گلوں کے کونوں پر کھڑے میراثی اپنے ناتواں پیچھے ہونے کی پوری قوت صرف کرتے ٹوٹریاں  
 بجاتے تھے۔ بارات نے بھی تین چار روز ٹھہر کر اپنی خدمت خاطر نہ کروائی۔ نہ ہی کوئی دھول ڈھمکا ہوا اور نہ ہی جیڑ کو  
 چار پائیوں پر پھیلا کر اُس کی نمائش ہوئی۔ نہ ہی بخت جہان کی خواہش کے مطابق چار ہونے والی عورتیں اُس کی عزتوں اور برادری  
 کے چند لوگوں کے ہمراہ خاموشی سے۔ دو تین درجن گھوڑیوں پر سوار۔ آیا اور ماہلو کو بیاہ کر لے گیا۔ تو دھوم اگر مچی۔ اور  
 چرچے ہوئے اور تذکرے جو چھڑے تو وہ اُن دونوں کے بے حساب خُسن کے تھے۔ اُن جیسے جوڑے کبھی تو کسی داستان  
 سے تڑپ نہ سکتے تھے۔ نہ ہی سیف الملک میں بھی درج نہ تھا کہ اُن کے خُسن کا کوئی حساب نہ تھا۔

کچھ عرصہ بعد بخت جہان کی دہائی ہوئی۔ اس نے اپنے بچے بچھے بچھے  
 چلا کر اُس نے اپنی گھوڑی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کوٹ مراد جاتا تھا تو اُس برس گندم کے خوشوں میں دانے ڈالنے لگے۔

یہ اُن کے ملاپ کا کوشش تھا کہ بچینوں کے خُسن دودھ سے اتنے بوجھل ہو گئے کہ جس نہ سکتی تھیں۔ دو چار قدم

اٹھتیں اور دودھ کے بوجھ سے ڈھیر ہو جاتیں۔

جو ہڑوں کی سطح کو ڈھکی ہوئی کے کاسنی پھول جو کھیتاں کہلاتے ہیں اتنے کھلے کہ پانی دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔

اس سے ایک کاسنی چادر بھی ہوئی نظر آتی تھی۔

اُن کے بیاہ کی دھوم ایسے مچی۔

اُس شب جب ماہلو نے بے حجاب ہو کر اُس کا چہرہ دیکھا تو وہ فوراً اُسے پہچان گئی۔ عرشوں پر یہی چہرہ تھا۔ ایک

فرق کے ساتھ کہ تب وہ سہرا باندھے ہوئے تھا۔

اُسی شب جب امام بخش نے اُس کے سامنے یوں سر جھکا جیسے ایک دیوی کے سامنے جھکاتے ہیں اور کہا ”ماہلو

جیت چاہے۔“

اُس نے بس دو چار فرمائشیں کیں۔ جھجک کر۔ لپاتے ہوئے منہ میں پلو گھسیڑتے ہوئے نہیں اُس کی آنکھوں

میں بے حجاب دیکھتے ہوئے کہ وہ جو اُسے عرشوں پر دیوتا ہو چکا تھا اُس سے شرمناک لگتا تھا۔

مجھے ہر چہ متے مینے کی پہلی جمعرات کو اپنے چاہے اور بے بے سے ملنے کے لیے دنیا پور جانے دیا کرنا۔

میری اُس گھوڑی کے پاؤں میں جو مجھے دنیا پور سے کوٹ مراد لے کر آئی تھی جھا بھریں ڈلوادینا..  
اور تو... یہ کاشکارِ و اسی نیکی ترک کر.. کہیں آیا جانا نہ کر.. بس میرے سامنے بیٹھا رہا کر..

ان فرماشتوں کے جواب میں امام بخش نے صرف ایک فرمائش کی.. تو ایک بار جانوں کے دارے کے صحن میں  
شیشم کی شاخوں سے بندھی ہوئی پیٹنگ پر صرف ایک بار میرے لیے وہ پیٹنگ بھوٹ.. اُس کے ہارے لے..  
پر مابلو نے صاف انکار کر دیا وہ کھڑکھڑستی تھی.. امام بخش.. پیٹنگ کا وہ بھارا زندگی میں بس ایک بار ہوتا ہے..  
جیسے عشق ایک بار ہوتا ہے.. اگر اُس ایک ہارے سے کوئی تجھ سانصیب ہو جائے تو پھر وہ بارہ ہارے لینے سے فائدہ..

یہ جو عشق اور چاہت کے جھولے تھے جن پر مابلو اور امام بخش جھولتے تھے.. اور حافظہ بر خوردار کا ہاتھی عشق  
سندور یا اُن دونوں کو روندتا تھا اور مرزے کی صاحبان کی مانند مابلو ایک جام شراب کا تھی جس کے اندر جوش تھا اور وہ چشم  
پیالے یار کے پی کے مد ہوش ہوتی تھی تو یہ سب کچھ امام بخش کی پہلی بیوی حیات بی بی بھی تو دیکھتی تھی دیکھتی تھی تو دعا کیں  
کرتی تھی کہ شالا یہ دونوں مرجائیں.. اُن کی عمر بڑھ جائے اور وہ بھی اُس کی حیاتی کے سوتے کھلیان میں ایک  
انکارے کی مانند آگری تھی پورا سے جلا جلا کر رکھ کر رہی تھی..

اُسے یہ خدشہ بھی ہونے لگا کہ مابلو کی سیپ میں امام بخش کا ابر نیساں جو برسوں سے اُس کے نتیجے میں کوئی بہت  
کام کا موتی جو میں آنے کو ہے.. بے شک اُس کے تین بچے تھے پر جیسے مابلو کے سامنے وہ کچھ نہ تھی اسی طور اُس کے تین  
بچے مابلو کے سامنے کچھ نہ تھے.. اُس کے سامنے وہ کچھ نہ تھے.. اُس کے سامنے وہ کچھ نہ تھے.. اُس کے سامنے وہ کچھ نہ تھے..  
جہاں ہمدرد کے خاندان میں قدیم زمانوں سے ایک ایسی روایت چلی آ رہی تھی جو ایک لوگ داستان میں  
دھل چکی تھی.. ہر نسل میں خاندان کے کسی نہ کسی فرد کے ہاں ایک سوہنی جنم لیتی تھی اور اُس نسل میں ایک کید و بھی پیدا  
ہو جاتا تھا..

اور اس سوہنی کے ماتھے پر بھگواں گہلیاں ہوتی تھیں.. اور وہ سوہنی جانتا تھا..  
اور جو کید ہوتا تھا اُس کی عمر طویل ہوتی تھی اور وہ سوہنی جانتا تھا..  
یہی سوہنی جو ہمیشہ مابلو کہلاتی تھی محمد جہان کے گھر پیدا ہوئی.. جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی اُس کے خُسن کی  
روشنائی سے دنیا پور کے کچے بام و در روشن ہونے لگے.. وہ چاندنی راتوں میں اپنی سکھوں کے ہمراہ جب لگن مٹی کھیلتی تو  
ہمیشہ پکڑی جاتی کہ وہ جہاں کہیں بھی جا کر چھٹی کسی اندھیاری کوٹھڑی میں روئی کے ڈھیر کے اندر یا کسی شجر کی گھنی شاخوں  
میں اُس کے خُسن کے چکا چوند چراغ اُسے ظاہر کر دیتے..

اگرچہ اُس کا نام صفرا بی بی رکھا گیا تھا پر ہولے ہولے سب لوگائی بھول گئی کہ اُس کا اصل نام کیا تھا.. وہ اس نسل  
کی مابلو تھی جو کبھی بھاگ والی نہیں ہوتی پر وہ جہاں سے بھی گزرتی تھی اپنے پیچھے نور کی ایک کبکشاں چھوڑ جاتی تھی.. یہی  
لوگائی یہ بھی کب کی جان چکی تھی کہ اس نسل کا کید و سوائے بخت جہان کے اور کوئی نہ ہو سکتا تھا..

تقریباً دو سو برس پیشتر مولوی حاکم دنیا پوری نام کا ایک پنجابی شاعر ہو گزرتا تھا جس نے اُن زمانوں کی مابلو کے  
خُسن کی توصیف میں کئی سو صفحات پر محیط ایک قصیدہ لکھا تھا جو زبانِ زد عام ہوا.. مولوی حاکم کا باہر کی دنیا میں کچھ زیادہ چرچا



تھیں۔ صرف اس لیے کہ وہ دنیا پورا ایسے نسبتاً گمنام قصبے کا باسی تھا اور ایک ایسی زبان میں کلام کرتا تھا جس کے گرد ان انجینی  
یہ جس کے پیرے تھے جنہیں شاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ اُس کی رفعت خیال اور قادر الکلامی اگر اس  
سے نکل جاتی تو کل عالم میں اُس کی دھوم مچ جاتی پر ایسا نہ ہوا اور وہ گمنامی میں مر گیا۔ وہ مسجد والے حافظ جی کے  
آپ بھائی میں سے تھا اور اُن کے گھر سے میں اُس کے چھ دیوانوں میں سے ایک کے چند بوسیدہ اوراق اب بھی ایک طاق  
میں چڑے تھے۔ شائد ان زمانوں کی جو مابلو تھی یہ مولوی حاکم اُس کے حُسن کا اسیر ہو کر ہی شاعر ہوا۔ وہ اُس مابلو کے بارے  
میں کچھ نہیں بیان کرتا ہے۔

تیرے رنگ روپ کے انگارے۔۔

گھرے میں چلے کاٹے درویش کو بھی جلا کر رکھ کر دیتے ہیں۔۔

جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ تجھے دیکھ کر پہچان ہو جاتے ہیں۔۔

اور جو بے ایمان ہو جاتے ہیں وہ ایمان لے آتے ہیں۔

تیرے بدن میں کوہ طور کا نور ہے۔۔

اور اس میں سے عاشقوں کے لیے صحیفے نازل ہوتے ہیں۔

مابلو کے زمانے میں وہ بھائی میں سے تھا اور اُن کے گھر سے میں اُس کے چھ دیوانوں میں سے ایک کے چند بوسیدہ اوراق اب بھی ایک طاق  
میں چڑے تھے۔ شائد ان زمانوں کی جو مابلو تھی یہ مولوی حاکم اُس کے حُسن کا اسیر ہو کر ہی شاعر ہوا۔ وہ اُس مابلو کے بارے  
میں کچھ نہیں بیان کرتا ہے۔

تیرے سانس سے سفید کھن سہری ہو جاتا ہے۔۔

تو کئی گھنٹہ نہ اٹھا کر۔۔

جکی دیواریں تجھے چھونے کی آرزو میں ڈیر ہو جاتی ہیں۔۔

گندم کے ہرے کھیتوں میں چلا کر۔۔

تیرے بدن کی حدت سے گندم کے کچے دانے پک جائیں گے۔۔

اور یہ جان لے کہ نصیب صرف شکل والوں کے نہیں ہوتے۔

بد شکل دریا پار کر جاتے ہیں۔۔

اور شکل والے بچ منجھدار ڈوب جاتے ہیں۔۔

یہ مولوی حاکم دنیا پوری کے زمانوں کی دوسو برس پیشتر کی مابلو تھی اور عہد حاضر کی 1929ء کی مابلو محمد جہان  
تیسرہ کی بیوی بیٹی گھوڑی پر سوار اپنے سینے جاتی تھی۔  
یہ ماگھ کے مہینے کی پہلی جمعرات تھی۔

اس گھوڑی کا نام بھی "مابلو" تھا اُس کے پاؤں میں چاندی کی جھاٹھریں چھنکتی تھیں کاٹھی پر سونے اور چاندی  
کے پتھر جڑی ہوئی تھیں۔ اُس کے نحتوں میں خالص سونے کی ایک بھاری تھک دکتی تھی۔ گھوڑی کی باگ جسے ایک نائن

نے تھام رکھا تھا وہ بھی سونے اور چاندی کی تاروں سے گندھی ہوئی تھی۔

پہلے تو گھوڑی کو اُس کا وجود ایک ہڈ سے بھی ہلکا محسوس ہوا کرتا تھا اور وہ اُسے لے کر آڑی آڑی جاتی تھی پر آج وہ اُس کے بوجھ تلے دبی جاتی تھی اُس کے گھٹنے بھڑکتے تھے اور ٹانگیں یوں لرزتی تھیں کہ اُس کے پاؤں میں بندھی چاروں جھانجھریں بھی لرزتی ٹھکتی تھیں۔

آج پچھلی تمام جمعراتوں کے نسبت مابلوکا بوجہ اس لیے زیادہ تھا کہ وہ گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ گلے میں اوپر نیچے تین چار کینٹھے تھے دسوں انگلیاں انگوٹھیوں سے بھری ہوئی، کانوں میں درجن بھر دینر خالص سونے کے گوکھڑا اور بازوؤں پر تنگ ہوتی کندھوں تک پہنچی ہوئی ان گنت چوڑیاں کانوں میں نہ صرف شانوں تک آتے جھمکے تھے بلکہ جڑاؤ مڑکیاں بھی لگی تھیں۔ تاک میں لوگ اور ایک چوڑی نتھ جو اُس کے رخساروں کو نیچوٹی تھی۔ پورے ماتھے کو ڈھلتا ہوا جھومر اور ٹخنوں سے شروع ہو کر گھٹنوں تک سونے کی جھانجھروں کا انبار۔ گھنی سیاہ چوٹی کے ہر بال کے ساتھ سونے کا ایک تار کندھا ہوا۔ تبھی تو وہ اتنی بھاری ہو رہی تھی۔

مثال مشہور تھی کہ امام بخش اُسے ہر روز ایک نیا زیور لا کر دیتا تھا اور زیوروں کے اس ذخیرہ کو رکھنے کے لیے اُس نے لوہے کا ایک چھوٹا سا بھڑولا بنوایا تھا۔

اس بھڑولے میں ذخیرہ شدہ جتنے بھی کہنے تھے وہ سب کے سب آج باہلو نے اپنے بدن بھجوا رکھے تھے اس لیے اُس کی آنکھیں پانی تھیں۔ باہلو نے سنا کہ اس کا نام بھی تھا اور کچھ بھی تھی کہ ہر وقت گہنوں سے مٹی چسپندی ان کی نمائش کرتی پھرے۔ عام حالات میں وہ صرف ایک دونوں ہموں کا سنگھار کرتی۔ آج اگر اُس نے اپنے آنکھوں کو لاد لیا تھا تو جانے کیا بد مزہ تھی، کیا بھید تھا۔ پر جس کسی نے بھی اُسے گلی میں سے گزرتے دیکھا، باہو جولاہی نے۔ پھاو کھمبہ کی اور آشاں ماچھن نے۔ یہاں تک کہ حافظ جی نے بھی۔ وہ سب کنگ ہو کر رہ گئے اُس پر ایسا رُوپ چڑھا ہوا تھا کہ اُس پر نظر نہ پڑتی تھی۔ باہلو نے کچھ باتیں کہیں ہوئیں، آقا سے دیکھتی ہوئی نظر نہ آئی تھی۔ دوسرے پاؤں تک گہنوں میں ڈھکی نہ اوجھی گئی تھی اور نہ چھوٹے دل والی بلکہ ایسی لگتی تھی کہ ہر ایک کے دل کو جاکتی تھی اور اس میں دیکھنے لگتی تھی۔

وہ ساری کی ساری گل رنگ ہفتی سنہری کرنوں میں رنگی سنہری ہوتی تھی پر سنہرے پن کے اُس دھکتے کھیت میں یہ اُس کا چہرہ تھا جو زرد سرسوں ہو رہا تھا۔ اُس کا رنگ زو پ بچھا ہوا تھا اور اُس پر سرسوں کے پیلے سائے بڑھتے جاتے تھے۔ مہنداں جو لابی کی تقریباً تاریک ہو چکی آنکھوں میں اُس شام ایک چمک سی چمکی۔ اُس نے چہرے کی گھماوٹ کو تھیلی سے یکدم روک دیا۔ نامکمل لپٹی کو ہلکے سے اتار کر چٹیلر میں رکھا اور اپنی بیڑھی کو تھامتی ہوئی بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ بے شک ایک مذمت سے اندھی ہو چکی تھی۔ اُسے تیز دھوپ میں کبھی کوئی سائے سے تیرتے محسوس ہوتے پر اس کے سوا اُس کی آنکھیں تاریک تھیں اور اس کے باوجود اُس کے طور طریقے روزمرہ کے معمولات ویسے ہی چلتے تھے جیسے کہ وہ تب تھے جب اُسے دکھائی دیتا تھا سرشام پہلا دیا اُس کے صحن میں روشن ہوتا۔ وہ دن بھر میں اتنا سوت کاتی کہ کوئی

حسن مہتاب بھی نہ کات سکتی۔ اُس نے اپنی نایابائی میں بیڑھی کو تمام کر سست کا تعین کیا اور وہ چھٹک گئی میں سے آتی تھی وہ  
کچھ گھٹک میں پاؤں دھرتی چوکھٹ کے ساتھ آگئی اور اُس لمحے وہ چھٹک اُس کی بے نور آنکھوں سے کانوں میں اتر آئی۔

”ماہلو! اُس نے جیسے چوکھٹ سے سرگوشی کی۔ ”یہ تو ہے دھپے؟“

چھٹک جیسے اسی نام کی منتظر تھی۔ بڑک گئی۔

”آہو چاہی۔ میں ماہلو ہوں۔ سلام اے۔“

”والہیکم سلام دھپے۔ تیری بے بے تو تیرے وچھوڑے میں کھلی ہوئی ہے۔ کوئی بھی جمعرات ہو وہ چوکھٹ پر مٹھی

تھی۔ کتنی ربتی ہے۔ بھائی محمد جہان بھی تو چار پائی سے لگ گیا ہے۔ رپ خیر کرے۔ پھر کوئی جیا جنت کی بھی امید ہے؟“

کیسے ایلوں میں پھونکیں مارتی اُس دھلی شام میں بہشت بی بی کے کان جو صبح سے منتظر تھے اُن میں ماہلو کی

تھکتی کی پازیبوں کی چھٹک تب آئی جب وہ چوکھٹ کے باہر آئی۔ وہ تمام لہجہ اللہ کتنی اٹھ کھڑی ہوئی دھواں آلود  
تھکتی کو دھپے سے پوچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

بائیں ہاتھ کے کواپنے دانتوں سے دبا یا تو اُس میں گندھے چاندی کے تاروں نے اُسے بہشت لفت دی۔ پر وہ

سب سے پہلے آگے بڑھ کر چوہدرانی ماہلو کو سہارا دے کر گھوڑی سے اُتارے۔ پہلے تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر کی چوکھٹ کو دیکھ کر  
تھکتی سے اتر کر آئی۔ وہ اُس کے پاس آئی۔ کتنی سراسیمہ تھی۔ پھر آج کے سہارے کی

دھات تھی۔

وہ اپنے ٹیکے کے ویئرے میں داخل ہوئی تو دھریک کا وہ بونا جس کے ساتھ ساتھ وہ ملی ہوئی تھی اپنے زرد پتے

گھٹکے لگا اور وہ پتے اُس کے چھوٹے چہرے کو اور بھی زرد کر گئے۔

دھواں آلود آنکھوں میں سے بہشت بی بی کے دھپے کو دیکھتی ہوئی بہشت بی بی آگے بڑھی۔ دھریک کے زرد

تھکتی میں زرد ہوتا چہرہ اُس کی ماہلو کا تھا اور وہ اُس کے گلے لگ گئی۔ اُسے اُس کی ماں کو احساس ہوا کہ اُس کے رخساروں

کے ساتھ لٹک ہے۔ اُس کے سرسوں رنگ چہرے پر جدائی کی ایک نیم مردنی اور تھکاوٹ ہے اور اُسے اچنبھا بھی ہوا کہ

بہشت بی بیوں سے کج جانے والی اُس کی بیٹی نے آج اپنے آپ کو اتنے ڈھیر سارے گھنوں سے کیوں بوجھل کر لیا ہے۔

”بہشت بی بی!۔ ”پیارے اندر سے ایک چار پائی سے ایک لاغرا واڑ آئی“ ماہلو آئی ہے؟“

”آہو محمد جہان۔“

”اُسے کب کب آ جائے۔“

”اُسے اپنا سانس تو درست کر لینے دو۔ آ جاتی ہے۔ ماہلو۔“ بہشت بی بی نے اُس کے سر دھو تے رخساروں پر

تھکتی کو ایک ایسی کچھکھکانے والی تشویش سے کہا جو صرف ماؤں کے بدن میں سے تب جنم لیتی ہے جب کچھ نہ کچھ

تھکتی ہے اور جو ہونا ہوتا ہے وہ اچھا نہیں ہوتا اور ہو کر رہتا ہے۔ ”دھپے تو ٹھیک تو ہے ناں؟“

”آہو بے بے۔“



ماہلو نے اپنے چار پتھرے ایک نگاہ کی باہل کا یہی ویہڑا تھا جس میں وہ ایک چڑیا تھی۔ کوٹھے تک جاتی سیڑھیوں کے نیچے جہاں گیلے اُپلے سنگ رہتے وہاں دودھ کی وہ چانی ہوا کرتی تھی جس کی سطح پر موٹی زرد رنگت کی بالائی کی تہہ ہولے ہولے دیز ہوتی جاتی تھی اور وہ اپنی بے بے سے چوری چھپے گندم کے ایک تنکے سے اُس بالائی میں چسید کر کے دودھ سُک جایا کرتی تھی اور بے بے کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ ”میری بہنیں! میرا بچہ بھرا.... کہاں ہیں؟“

”وہ سب یہیں ہیں ماہلو۔۔۔ پر تو ٹھیک ہے ناں؟“

”آہو بے بے۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی ماں کی آغوش میں ذرا غصہ نہ سکی۔ پر فوراً ہی سنبھل گئی۔

ہر ماں۔۔۔ کم از کم اُن گزر چکے زمانوں کی ماں اپنی کوکھ سے جہنم لینے والوں کے چہرے پڑھ لینے پر قادر تھی۔ اُس چہرے پر محبت کے کرشمے ہیں؟ دکھ ہے یا سکھ یا کوئی ایسی سوگاری ہے جس کا انجام نہیں معلوم۔ بہشت بی بی نے بھی اپنی بی بی کے زرد سرسوں چہرے پر جو کچھ برت تھا وہ پڑھ لیا تھا۔ ”تو ٹھیک نہیں ہے ماہلو۔ مجھے بتا دے۔۔۔ مجھے بتا دے۔۔۔“

اُس کے ماہلو کے زرد بچے چہرے پر ایک سکرابٹ لکھوئی جو یہ کہتی تھی کہ مائے میں یہ درد اور چھڑنے کا حال کس سے کہوں؟ ”آج صبح سوئے وہ میری سوکن حیات بی بی بولی کا ایک پیالا لے کر گھر سے پاس آئی کہ ماہلو ہماری بھوری بھینس کے ایک کنٹی کو جہنم دیا ہے تو یہ اُس بھینس کے تنھوں میں سے برآمد ہونے والا پہلا دودھ ہے اُس میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تیرے دن بھی ایسے ہیں کہ تجھے طاقت کی ضرورت ہے اسے بی بی لے۔ تو میں نے بولی کا وہ پیالا پی لیا۔۔۔ بے بے میری ماں کی جگہ بی بی نے مجھ کو دیا ہے۔ بے بے اُس بولی میں نے ہر گز نہ بھرا تھا۔۔۔ میں یہاں مرنے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے تو نے اُس دارے کے پار جہاں میں نے ایک مرتبہ پیٹنگ جموئی تھی اُن کے پار قبرستان میں چاہے الف بھان کی قبر کے برابر دفن کرنا ہے۔ ان سارے گہنوں زلیوروں اور ٹومبول سمیت اُن کے میں!“

ماہلو کا یہ قصہ بے شک ایک دلچسپ اور دلکش قصہ ہے۔ لیکن ایسا ہوا تھا اور بلا مبالغہ سو فیصد ایسا ہی ہوا تھا۔

اُس کی موت کے بعد امام بخش حواس کھو بیٹھا تھا اور دنیا پور کے قبرستان میں ماہلو کی قبر کے سر ہانے ایک چمچر ڈال کر اُس میں رہنے لگا تھا۔ وہ پورے دو برس وہاں مقیم رہا پھر کوٹ مراد واپس آیا لیکن نگلن پور کے راستے جہاں کی سب سے بدنام طوائف شیداں پاؤنڈوں والی کے ساتھ نکاح کر کے وہ اُسے اپنے ساتھ لے آیا اور حیات بی بی سے کہنے لگا۔

”تو نے ماہلو کو زہر دیا۔۔۔ میں تیرا گلا گھونٹوں گا۔۔۔ نہ تو کے سے تیرے ذکرے کروں گا۔۔۔ میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو دن رات تڑپے گی۔ رورو کر مجھ سے معافی کی خواستگار ہوگی پر میں تجھے بخشوں گا نہیں۔ تو نے ماہلو کو قبول نہیں کیا تھا تو اب اس عشتیٰ کو قبول کر۔۔۔ آج سے یہ تیری سوکن ہے گھر کی مالکہ ہے۔ اور تو اس سے مانگ کر روٹی کھائے گی۔ اس گھر میں میری خواہش پر دن رات نہرے ہوں گے۔ اس کے عاشق آئیں گے اور تو۔۔۔ اُن کی خدمت خاطر مدارات کرے گی اور اپنے ہاتھوں سے اپنی سوکن کو گھٹکھروا باندھا کرے گی۔“

اور دن رات ایسا ہی ہونے لگا۔

میں موت کے پورے تین برس بعد ماگھ کے مہینے کی پہلی جمعرات کو حیات بی بی نے اپنے کپڑے پھاڑ دیے۔  
 وہ جی آئے گا ڈھیر تھا اور ایک پھلنی تھی۔ وہ آئے کو چھانی میں چھانی رہتی۔ ایک بار چھانی اور پھر اُس  
 کے چہرے میں بخت جاتی۔ اُس نے آئے کے اُس ڈھیر کو سٹکڑوں بار تو چھانا ہوگا۔ ایک روز اُس کے چہرے  
 میں آئے کے ڈرے اُسے ایک بھتی کی شکل دیتے تھے جب امام بخش نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور گھسٹا ہوا  
 گھونٹ نکالے گیا۔ ”اب تو بھی وہاں جا جہاں مایلو چلی گئی ہے۔ دفعتاً ہو چڑھیلے۔“

اس مظلوم داستان میں کہیں یہ درج نہیں کہ حیات بی بی اُس چوکھٹ کے پار ہو کر کہاں گئی۔ کب تک زندہ رہی۔  
 البتہ امام بخش نے اُسی روز شیداں پاؤنڈوں والی کو طلاق دی اور اُس کی جھولی سونے کے پاؤنڈوں سے بھر کر

سے نکلت گئی۔

کبھی کبھار دنیا پور کے جانوں کے دارے میں شیشم کے درخت کی ٹہنیوں سے بندھے جھولے کی رتی کو تھام کر  
 اُسے روتا رہتا۔ مایلو کو دفن کیا کہ جب وہاں آئے تو اُس کی سلفی بکھا کہ اُس کی داڑھی جتنی سفید ہو چکی

ایک سچے بیوی تیلی جانوں کے دارے میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ جھولے کی رتی جو مدری امام بخش  
 سے بندھے ہوئے ہے اور وہ مر چکا ہے۔

UrduPhoto.com



اُس کروندے سانپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُسے کالا شاہ کا کوکے دھان کے کھیتوں میں تیرنے والے اور ویران کھیتوں میں اُگنے والے ایک چمکیلے چاندی رنگے سانپ نے دس لیا ہے۔۔۔ وہ اتنی اذیت میں تھا۔

یہ کروڑوں یا گاؤں سے بہت پرچے پہاڑوں پر چڑھ کر کسی کی خدمت میں تھکسی ہوئی بمشکل پہنچتی تھی۔ مائے کے بانوں سے بھی پرے پہاڑ ہریا دل یکدم منقطع ہو جاتی تھی اور ایک رڑھا ہموار میدان جس کی مٹی میں سنگر اور ٹھیکریاں گھنڈے سے ہونٹے تھے اور وہ شکر دو پہر میں یوں سلگنے لگتے تھے کہ اُن میں سے دھواں اُٹھتا دکھائی دے لگتا تھا اور وہاں ہریا دل کا ایک ٹکا بھی ناپید تھا۔ جس کے بارے میں جاٹ کہتے تھے کہ ہمیں حافظ جی جانے دوزخ سے کیوں نکالتے ہیں اس سے بڑھ کر بھڑکاؤ تو کبھی نہیں آتا۔ وہاں کہاں ہوگا تو کبھی نہ ملے گا۔ اس سے بڑھ کر وہ ہو چکی تھیں۔ اور کھیتوں کے چوہوں کو لٹکنی کی آرزو میں انہی سلتے سنگروں اور ٹھیکریوں پر اپنا کوئل بدن سمیٹا سکتا تھا۔ اس پر کوئی غدا بھرتا تھا بلکہ وہ اُس سینے اور بدن کے کیڑے نے سے کسی حد تک لطف اندوز ہوتا تھا۔

آج۔ اپنے بل کی تارکین میں خوشیوں سے نہایت مسرور ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ وہ جوش میں آ کر اپنی زبان سرسرااتا تو اُس پر بل کی مٹی تھڑوی جاتی۔ وہ اُس اذیت کو برداشت نہ کر سکتا تھا جو زمین کے اندری اندر ایک مَلُوف دھمک کے ساتھ اُس کے کانوں پر نہیں تھے اُس کے پچیلے بدن پر مسلسل دستک دیتی تھی۔ ویسے بھی وہ ان دنوں بے حد حساس ہو چکا تھا۔ بے آرام اور بے چین تھا کہ اُس کے بدن کو مَلُوف کیے جو کپٹلی تھی وہ بے جان اور مردہ ہو کر اُتر جانے لگی تھی۔ اُس نے کئی بار اُس رُز سے میدان میں گنگروں پر لوٹ کر اُن کی رُڑ سے اُس کپٹلی کو اُتارنے اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شاید وہ ابھی تک مکمل طور پر خستہ نہ ہوئی تھی اور وہ اُس میں سے کسمسا کر باہر نہ آ سکا۔ اسی لیے وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور سست ہو چکا تھا۔

یہ زمین کے اندر ہی اندر سفر کرتی دھمک کی اذیت ہی اُسے یوں محسوس کرنے پر مجبور کر رہی تھی کہ جیسے ایک چمکیلے چاندی رنگے سانپ نے اُسے دس لیا ہے۔ کروند یا غریب تجھان تھا جو اُس عذاب کو سہتا تھا۔

وہ شریف انفس صوفی منش پھر نکلا جو دنیا پر کے قبرستان میں مابلوی کی جگی قبر کے اندر سکھ چین کی حیاتی بسر کرتا تھا، اُس کی بوسیدہ ہڈیوں میں اور کبھی کھوپڑی کے اندر خوابیدہ رہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار وہ ذرا بے آرام ہوتا۔ اُسے واہمہ ہوتا





اور روز روز کنویں کون کھدواتا ہے۔ اگر وہ ایک عام کاشت کار ہو، مغل بادشاہ نہ ہو۔ چونکہ اُن دنوں قناعت بہت تھی جو دراصل کابلی کی ایک معزز قسم ہے چنانچہ یہ کہاوت عام تھی کہ جس شخص کو دودھ کا ایک پیالہ اور گندم کی دو روٹیاں مل جائیں اُسے اور کیا چاہیے۔ اور برسوں بعد کسی نمبردار یا چوہدری کو خیال آ جاتا کہ اور بھی بہت کچھ چاہیے کیوں نہ میں اپنی زمینوں پر ایک کنواں کھد واکر اُن کے بچر پن اور ویرانے کو سرسبز، خوشحالی میں بدل دوں۔ لیکن ایک کنواں کھدوانے کے اخراجات اتنے تھے کہ متعدد بار لوگ فلاح ہو گئے اور کنواں نامکمل رہا۔ کرم داد اور مولاداد بھی منہ بھر کر رقم طلب کرتے اور پھر جتنے مزدور معمر ہوتے وہ بھی اسے سخت جان مشقت قرار دے کر مزدوری کے علاوہ روزانہ پرانٹھوں، انڈوں اور گوشت کی فرمائش کرتے۔ اُس نمبردار یا چوہدری کا بھر کس نکل جاتا۔ اسی لیے روز روز کنواں کون کھدواتا تھا؟ محمد جہان اگرچہ خصلت میں ایک قناعت پسند رویش تھا لیکن اُس کے ذہن میں بھی یہی خیال آ گیا۔

اُس سنگریزوں سے سلگتے بے آباد ویرانے کو سیراب کیا جائے۔ میں نے اپنی دونوں بیٹیاں بیاہنی ہیں، اپنے اکلوتے بیٹے عزیز جہان کے مستقبل کو سنہار دیکھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ ایک دو روٹیاں میرے لیے تو کافی نہیں ہیں۔ تو یہ دھک زمین میں سفر کرتی دھک دھک.. کروٹ دیتے، چھپکے اور ویرانے والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کرتی.. یہ کرم داد اور مولاداد کی کدالوں میں سے جنم لے رہی تھی جو محمد جہان کے لیے ایک کنواں کھدوانے کے لیے تھے۔ اُن درجن بھر مضطرب اور دین دار مزدوروں کے بیلوں کی زمین میں اترنے کی آوازیں تھیں.. جو اُن کے معاون تھے۔

UrduPhoto.com

کوئی جاٹ، زمیندار یا چوہدری جوں کو جس میں دابے تلے پاؤں سفر کرتا اور جب کوئی گاؤں آتا تو اُسے پہن کر اُس میں سے گزر کر پھر سے اُسے بغل میں داب لیتا کہ کہیں وہ خراب نہ ہو جائے۔ کسی مرگ پر افسوس کھانے کی خاطر یا کسی پیدائش کی مبارکباد دینے کے لیے گزرتا۔

یا پھر کوئی ڈنٹوں کا مارا آؤ کہ کہیں جو دھک دھک یا گیا تھا وہ اب گھر پر اچھا لگا اٹھا لاوے کسی ایسے در کی تلاش میں جس پر وہ پڑا رہے۔ بزم بلاتار ہے اور اُسے دو وقت کی روٹی مل جائے۔

یا کوئی میراثی دادا جو اپنے چوہدری کی بیٹی کا رشتہ پکا کرنے کی خاطر طویل مسافت کرتا ہو۔

کوئی مجذوب، کلاہیوں میں کھلتے آہنی کنگنوں کو ایک ڈنڈے سے مضطرب کرتا ”جس ویلے یعقوب نبی تھیں یوسف ہو یا رافعی“ گاتا اُس ویرانے میں سے گزرتا۔  
تو وہ ٹھٹھک جاتا۔

دنیا پور کے محلہ مغربی سے پرے.. جو بڑا اور مالٹے کے پانچوں سے پرے جو ایک بے آب و گیاہ ویرانہ ہے جہاں تھوہر کے پودے بھی بمشکل پنپتے ہیں، وہاں اُس کے درمیان میں یہ موج میلہ اور رونق کیسی ہے۔ ویرانے میں یہ انہونی بہار کہاں سے آگئی ہے..

محمد جہان ہمہ وقت مگرانی کے لیے وہاں موجود ہوتا۔ کرم داد اور مولاداد اور درجن بھر مزدوروں کے معاوضے اور اُن کے روٹی پانی کے بندوبست پر اُس کے بھڑولے جو کنگ سے بھرے تھے، خالی ہوتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ موجود





پہروں بیت گئے۔

محمد جہان روتا رہا۔ خوفزدہ فریاد کرتا رہا۔ پروہاں کون سننے والا تھا۔ ایک بچہ بے شک کتنا ہی غدر ہوا اگر ایک زہریلا سانپ ایک گرم سنالے کی ویرانی میں اُس کے بازو سے لپٹا ہوا اور اُسے شکستے میں کستا ہو تو وہ فریاد کرنے لگتا ہے۔ بلکتے لگتا ہے کہ مجھے بچالو۔

یقیناً سانپ بھی اُسی خوفزدہ و حالت میں تھا کہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور وہ بھی من ہی من میں دوہاتی دہتا تھا کہ.. مجھے بچالو۔

دو پہر ڈھلنے لگی۔

اور پھر دور سے ایک گھرو سوار آتا دکھائی دیا۔

وہ قریب آیا۔

ایک بچے کو سر اسیمگی اور دو ہشت زدہ سگوت تک ایک دیر لپٹنے میں ایک وحشی دو پہر میں دیکھا تو رک گیا اور فوراً ہی آگاہ ہو گیا کہ بچے کی یہ کیفیت کیوں ہے۔ اُس کے ننھے منے بازو کو ایک سانپ نے لپٹی لپیٹ میں لیا ہوا تھا جس کا سر اُس کی منقش مٹھی میں بچنا ہوا تھا۔

وہ اپنی گھوڑی سے اُترا۔ نہایت احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم دھرتا محمد جہان کے نزدیک ہوا ”حوصلہ رکھنا ہے جوان.. جہاں کستا ہوں کرتے جاؤ..“

UrduPhoto.com

جہاں کے انگلوں سے گھدیا دیا، سر نہ ہڈیا۔

”رام سے جہاں کھڑے ہو ہیں بیٹھ جاؤ..“

اُس کے بیٹھنے کے عمل نے سانپ کو چونکنا کر دیا اور اُس نے اپنی پکڑ مزید مضبوط کر لی۔

”اب آہستہ سے اپنا پاؤں اُٹھائے کر دو اور سانپ کے بدن کو ان سنگریزوں پر چلیں رگڑو جیسے آری آگے پیچھے کرتے

ہیں.. اُس کا سر نہ چھوڑنا۔“

محمد جہان نے اُس کی ہدایات پر عمل کیا.. گرم اور سلگتے ہوئے سنگریزوں پر سانپ کا کوئل بدن بار بار رگڑنے سے بری طرح جھلنے لگا تو اُس نے نڈھال ہو کر اپنی گرفت و قبلی کر دی اور پھر ہولے ہولے اُس کے بل جھلنے لگے اور وہ بے جان سا ہو کر اُس کے بازو سے لٹک گیا..

”ابھی اُس کا سر نہیں چھوڑنا..“ گھوڑی سوار نے تنبیہ کی ”اب اسے اپنے سر کے اوپر سے لے جا کر یوں گھماؤ جیسے امرودوں کے باغ کا رکھا گو یا گھما کر طوطوں کو اڑاتا ہے۔ ایسے گھماؤ زور زور سے اور پھر یکدم اپنی مٹھی کھول کر اسے اپنے سے دور پھینک دو..“

سانپ زیادہ دیر نہ گرا کہ محمد جہان نے اُسے ایک دو مرتبہ ہی گھما کر پھینک دیا تھا۔ گھوڑی سوار نے فوراً اپنی جوتی اُتاری اور اُس کی جانب لپکا لیکن اس سے چند شتر کہ وہ اُسے کھل سکتا.. سانپ اپنے ادھ موئے پن سے باہر آ کر ایسا سبک رفتار ہوا کہ پل بھر میں جانے کہاں غائب ہو گیا..



نئی سے خلق سے اُتار کر اپنے کام میں بخت جاتے.. عنایت بی بی اُن کی سرکاری باورچن مقرر کی گئی تھی جو اُن کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی تھی۔

موج تو بچوں کی تھی، جن کے غول کے غول چلے آتے اور ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ وہ کسی ایسی جگہ پر قبضہ کر لے جہاں سے کنویں کے اندر جھانکنے سے آخری گہرائی تک نظر چلی جائے۔

وہ منہ کھولے.. بچو کے پیاسے اُس میں جھانکتے رہتے۔

اور اُس جھانکنے کا سبب بھی کچھ اور تھا..

اُنہیں انتظار تھا.. کہ کب بالآخر کنویں کی تہہ میں سے پانی اُٹھتے ہیں اور کب اُن میں سے اُن کا ظہور ہوتا ہے جن کے وہ منتظر تھے۔

مناسب اور طے شدہ ٹھکانے کے بعد وہ کنواں جو ابھی ایک گڑھا تھا اُس کے اندر سرخ اینٹوں کی پٹائی ایک دائرے کی شکل میں کی جانے لگی۔ ایسی پٹائی جسے صورت گزموں کا اور زولوں کی بھی کہہ سکتے تھے۔

یہ گول پٹائی گڑھے کے اندر سے برآمد ہو کر زمین کی سطح پر پہنچی اور پھر ایک روڈ کنارے سے بلند ہو کر دور سے ایک سربریدہ مینار کی مانند نظر آنے لگی۔

UrduPhoto.com

خوبصورت لوگوں کی تصویروں



عشق کا لے ناگ ایسی سیاہ مویں کو بل وے کر بخت جہان نے کنیز فاطمہ کی جانب دیکھا..  
 اُس کے کبھی کی امرت کور کے بدن میں جتنی بھی رہ گئیں، شریائیں اور بناوٹیں تھیں وہ ابھی تک ایک مُنہ زور گھوڑی کی  
 جھنڈ کی مانند تھی اور کسی ہوئی تھیں۔ اُن پر بخت جہان کے ہونے والے عشق نے بخت جہان کے نطفے سے جنم لینے والے دو  
 عین کی پیدائش کے کچھ آثار نہ گئے۔ ایسے بیٹے جو اتنے جوان جہان ہو چکے تھے کہ اُن کے لہجے کے تہ بند کھڑکتے تھے۔ پھر بھی  
 امرت کو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ اور بخت جہان جب بھی اُس کی جانب ایک نظر کرتا تو اُس کے تہ بند میں حکومت نہ رہتا..

”امرت کورے..“

”جہان..“  
 کہتے جہان کو پتہ نہ تھا کہ اُس کی آنکھوں میں اداویں تھیں اُس کے بدن کی سرسبزی ہوئی تھی۔  
 ”یہ جہانیاں..“

حافظ جی نے جب اُسے کلمہ پڑھوا کر مسلمان کیا تھا۔ امرت کور سے کنیز فاطمہ کیا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے  
 کلمہ پڑھا تھا کہ بخت جہان کے جسے کلمہ پڑھنے کے بعد اُس سے لگا کر وہ تمباکو جو اُس پر پہلے ایک کھڑکی ہونے کی حیثیت سے حرام تھا،  
 اُس کا ایک طویل کش لیا تھا۔ یہ اُس کی دیرینہ آرزو تھی۔ اُس نے بخت جہان کے حلقے پر انحصار نہ کیا اور اپنے لیے ایک  
 عیسوی حلقے کا بندوبست کر لیا اور وہ اُس کی ٹوپی میں کڑوا ترین تمباکو بھر کر اُس کے کش لگاتی۔ دھوئیں کو اپنے پیچھے پھروں میں  
 کھینچتی اور دیرینہ آرزو پوری کرتی تھی..

”بول جہانیاں..“

”اوئے کچھ نہیں..“ بخت جہان نظر پڑا کہ اُس سے پرے اسٹبل میں بندھی اتھری کو دیکھنے لگا جسے کاٹشکی دھڑ  
 ہونے سے بولے دھوپ میں آ رہا تھا اور اُس کی کھال بھی امرت کور کی مانند تھی ہوئی اور کسی ہوئی تھی۔ شہوت بھری تھی.. اُس پر  
 سوار ہو جانے کو جی چاہتا تھا..

اور امرت کور اُس شخص کی ہوس بھری آنکھیں اپنے گسے ہوئے بدن میں سمونے لگی جس کی خاطر اُس نے اپنا  
 گھریار اجاڑا تھا۔ اپنے دھرم سے مُنہ پھر لیا تھا۔ اپنا مُنہ کالا کر لیا تھا کہ جو کوئی بھی اپنے آبائی مذہب سے مُنہ موڑتا ہے اُس  
 کے خداوند پر کا لک مل جاتی ہے.. پر عشق کا سینہ دُری باقی دین مذہب کور وندتا چلا جاتا ہے.. اور وہ روندی گئی تھی..

دنیا پور مدمہ قدیم سے جاٹ کا شکاروں کی ایک بستی چلی آتی تھی اور یہ پنجاب کے بیشتر دیہات کی مانند ہندوستان کی دھڑکتی شہر رگوں، سیاسی اُتار چڑھاؤ اور زمانے کی رفتار سے الگ تھلگ جنگلوں، بیلوں ویرانوں اور دریا کناروں آباد ایسی بستی نہ تھی کہ وہ یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذہبی گروہوں کی کچھ فرق نہ پڑے اور وہ ویسی کی ویسی ہی رہے جیسی کہ وہ کبھی تھی۔ یہاں پر ذرا جہد تھی۔ جی ٹی روڈ اُس کے کناروں سے لگ کر لاکھ آبادی کی جانب چلی جاتی تھی یا شاید وہاں سے چلی آتی تھی اور پشاور پہنچ جاتی تھی۔ اُس کے پہلو پہ پہلو ریلوے کی پٹری بھی جاتی تھی اور آتی تھی۔ آبادی سے کچھ دور ایک ویران ریلوے سٹیشن تھا جہاں دن میں دو مرتبہ رونق ہو جاتی تھی یعنی دو پنجر گاڑیاں بس نکلتی تھیں اور رُک سکتے ہی پھر سے چلتی تھیں۔ شاید کوئی ایسی سڑک نہ ہو جس پر اتنے گاڑیوں کی آمد و رفت ہوگی جتنی یہاں کی ہے۔ اُس پر سوار ہوا ہو۔ دنیا پور کے والے کو دیکر مسافر دھلے دے کر حرکت کرتی ہوئی ٹرین میں سے اُتار دیتے تھے اور وہیں سے سوار ہونے والوں کی پہچان چٹیاں وصول کر کے پھر انہیں ڈبے میں کھینچ لیتے تھے۔ اجناس کی ایک اہم منڈی بھی تھی جس کے آڑھتیوں کا رابطہ گاؤں والوں سے بھی ہوتا تھا۔ جب فصلیں پکتی تھیں۔ چنانچہ دنیا پور پنجاب کے دیگر دیہات کی مانند پسماندگی کے کاہل پن میں بے خبر خوش و خرم گھس رہا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ یہاں کی زندگی بھی جی ٹی روڈ، ریلوے سٹیشن اور اجناس کی منڈی تک ہی محدود رہتی تھی۔ ان جانوں کے اُن مخلوں تک نہ پہنچ پاتیں جو جی ٹی روڈ سے دور ایک بڑے جوہر کے کنارے پر آباد تھے۔ ان جانوں کے پاس زمینوں کی نسبت تقاضہ زیادہ تھا اور انہیں اپنی بے خبری اور پس ماندگی پر نا تھا۔ البتہ ان مخلوں کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ یہاں دو چار سو برس اوہر یا اوہر ہونے سے انہیں کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔ یہ ویسے کے ویسے ہی تھے ویسے کے بھی تھے۔

جی ٹی روڈ کے آس پاس کشمیریوں کی اکثریت تھی۔

یہ کشمیری لوگ جانوں کے نزدیک نہایت کم ذات اور حقیر مخلوق تھے۔ اُن کے گئی گئین ہونے کا اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ہر کام کر گزرتے تھے جو جانوں کے نزدیک معیوب سمجھتا تھا۔ وہ سٹیشن سے لے کر جی ٹی روڈ تک نانگے چلاتے تھے اگرچہ تب کل تین نانگے ہی ہوا کرتے تھے۔ بازار میں بیٹاں ڈال کر پڑا فروخت کرتے تھے۔ جو تیاں گانٹھنے بیٹھ جاتے تھے۔ جولا ہوں کی مانند کھڈیوں پر دریاں اور کھیں بیٹھتے تھے۔ اڈے میں بس داخل ہوتی تو وہ پکڑے اور سوڈے کی بوتلیں فروخت کرنے سے بھی باز نہ آتے تھے۔ وہ کسی بھی کام کو مار نہ بچھتے تھے یہاں تک کہ درزیوں کا کام بھی کر





مانند تھا تھا۔ اور اُس جزیرے میں دن میں صرف دو ہارٹرین کی کشتی لنگر انداز ہوتی۔ اُس میں سے دو چار مسافر اپنے گھر تہبند اور گٹھڑیاں سنبھالتے اُترتے اور اگر اُن کی جیب میں دو چار پیسے ہوتے تو کسی ایک تانگے میں سوار ہو جاتے ورنہ گٹھڑی سر پر رکھ کر جی ٹی روڈ کی جانب چلنے لگتے۔ ان میں سے بیشتر کشمیری ہوتے جو لاہور شہر سے نیاری کا سامان خرید کر واپس آرہے ہوتے۔ بہت کم کوئی جاٹ ہوتا کہ اُن کا باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

البتہ کبھی کبھار ٹرین میں سے کچھ سکھ سردار بھی اُترتے۔

نوخیز بھی اور بوزھے کھوسٹ بھی۔

نوخیز نو جوانی کے بنار میں دھکتے وحشی شکلوں والے سردار لاہور شہر میں کوئی پہچان نیز منڈوا دیکھ کر آنے والے۔ اور ناف تک آتی سفید ریشمی داڑھیوں والے عمر رسیدہ سردار دربار صاحب امرتسر میں مٹھا مکینے کے بعد۔ سروں پر شوخ رنگوں کے شلو کے باندھے لوٹتے ہوئے۔ ان سب کا رُخ محلہ مغربی سے بالکل مخالف سمت میں واقع نشیمن سے پرے نت کلاں یا ٹیکے جیسے کی جانب ہوتا۔ ریٹوے لائن کے پار جو ایک قدیم قہستان تھا اُس کی گھٹی پیریوں کے سائے میں کچھ گھوڑیاں ہنسنے لگی ہوئیں اور وہ اُن بزرگ سکھوں کے لیے وقف ہوتیں جو یا تو اُٹھ لڑتے تھے۔ وہ اپنی داڑھیاں سنوارتے۔ کپڑا میں سنبھالتے۔ کھائیوں میں کھٹکتے لوہے کے کڑوں کو محسوس کرتے اور اپنے ماتھے پر اُس دربار کا لمس محسوس کرتے جس کی بنیاد میاں میر صاحب نے رکھی تھی اُن گھوڑیوں پر سوار ہو کر یا تو نت کلاں کی جانب روانہ ہو جاتے اور یا پھر ٹیکے کی طرف۔ یہاں سے اُن کے گھر یا ان کے والدین کے گھر تھے۔ ان کے پاس ایک بڑا بڑا کھیت تھا۔ کھیت کے انت کلاں میں مسلمان جاٹوں کے دو چار نت گھرانے تھے اور اُن کے سوا تمام کے تمام سکھ جاٹ تھے۔ اور ہر جاٹ کے پاس بھی سکھوں کی اکثریت تھی۔

نت کلاں میں سکھ سے زور آور بانکا پڑے تھے سردار لہناں سنگھ تھا۔ بخت جہان کا بیلی اور سب سے موثر حایار۔ اُس کی ملکیت میں جو زمین تھی وہ بھی کچھ زیادہ نہ تھی، مگر روایات کے منسلک سے ہوئی تھی۔ پرنت کلاں صرف اُس کے نام سے جاتا جاتا تھا کہ چوہدری ہوتا سردار ہونا صرف زمین کی وسعت پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ ایک قدیم پڑے تکر ذہینت۔ رکھ رکھاؤ۔ میل جول۔ ایک بڑے دل۔ مہمان نوازی اور ذات کی برتری پر منحصر ہوتا ہے اور یہ ساری خوبیوں یا خامیاں سردار لہناں سنگھ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

وہاں نت کلاں میں بہت سے سردار اُس سے کہیں بڑھ کر زمینوں والے متمول تھے پر وہ لہناں سنگھ کے رعب داب کے آگے نہ ٹھہرتے تھے۔ نت کلاں میں شام ڈھلے جو بھی مسافر پہنچتا تھا وہ روٹی تکر، دودھ کے ایک پیالے، ایک بستر اور اگر وہ مسلمان ہے تو ایک حقے کا طلبگار ہوتا تھا تو وہ لامحالہ سردار لہناں سنگھ کا مہمان ہوتا تھا۔ چاہے وہ خود اُس رات بھوکا سو جائے۔ کچے فرش پر سو جائے پر اُس مہمان کو روٹی، دودھ کا ایک پیالہ، ایک بستر اور ایک حقہ ضرور مہیا کر دیا جاتا۔ بے شک تمباکو سکھ مذہب میں حرام ہے پر لہناں سنگھ اپنے ہاتھوں سے کڑوا دیسی تمباکو مسل کر حقے کی ٹوپی میں رکھ کر اُس پر سلگتے ہوئے اُپلے جاکر اپنے مسلمان مہمان کے آگے رکھ دیتا۔

محمد جہان کی مانند لہناں سنگھ بھی اپنے گاؤں کا نہر دار تھا۔ نہر داری کا معزز عہدہ آبائی ہوتا تھا اور نسل در نسل ایک



کبھی کبھی جب اُس کا ہاتھ کھلا ہوتا تو وہ اپنے یار کے لیے گوجرانوالا کے ٹھیکے سے دلائی شراب خرید لاتا۔ عام طور پر کیکری شراب کے متکے ہی تواضع کے لیے بندوبست ہوتے۔ ان جمعراتی محفلوں میں بخت جہان نصف منکا پینے کے باوجود قائم و دائم رہتا پر لہناں سنگھ بہک جاتا اور گچڑی اُتار کر اپنے بال کھول دیتا اور اپنے بیٹوں اور گھر والی امرت کو روگالیاں دینے لگتا۔ بیٹوں سے اُسے شکایت تھی کہ وہ ذرا نسوانی لگتے تھے۔ اُن کا سانس پکا نہ تھا اور بل چلاتے ہوئے بھی ذرا پھٹکتے تھے اور ماں کے ساتھ چھٹے رہتے تھے۔ امرت کو سہ سے اُسے کوئی اور گلہ تھا جس کا وہ اظہار نہ کرتا تھا۔

اور اُس دوران جیسے غیب سے اُن کے سامنے کچی ہانڈیوں میں دیسی گھی میں ٹھنڈا ہوا گوشت ظہور میں آ جاتا۔ اور وہ اُس پر جانوروں کی مانند پل پڑتے۔

مینے کی دوسری جمعرات کو شام ڈھلے لہناں سنگھ بن سنور کے ہشتی رنگ کی گچڑی باندھ کے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اُس کا رخ دنیا پور کی جانب کر دیتا۔

بخت جہان بھی اُس کی مدارات کا منسا سب بندوبست کرتا۔ سر و سامنے کی تیار کردہ کیکر کے پہلے توڑکی وہ شراب جس میں انگلی ڈبو کر لے دیا سلائی دکھادی جائے تو وہ انگلی ایک مشعل بن کر بھڑکنے لگتی ہے۔

جمعراتوں کا یہی بخت جہان اور لہناں سنگھ کا آنا جانا لگا رہا۔

اور یہ امرت کو راس کی لہناں سنگھ کی گھر والی کوئی معمولی گھر کی نہ تھی خیر کا چیمہ کے سر سے اکھڑا اور اجڑا سرور۔ امرت سنگھ نے اپنی بیٹی امرت کو رکی چال و حال اور ایک کھلی دعوت ایسی بے پاکی بدن کی حب ہی محسوس کرتی تھی جب وہ اُن کی طرف بارہ برس کی تھی اور اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اُس بے قابو ہو جانے والی عروج کو جلد از جلد کسی گیس میں گس دینا بہتر ہوگا۔ اور وہ کھینچت کلاں کا توانا مضبوط قامت نو جوان لہناں ہی رکھتا تھا۔

لیکن کچھ ایسا ہوا کہ لہناں سنگھ کو رکیں اپنی امرت کو راس سے لے لیں ایک ایسا غلیظ ثابت ہوئی جو اُسے سانس نہ لینے دیتا تھا۔ دن رات مصروف رکھتا تھا۔ دو بیٹوں کی پیدائش کے باوجود امرت کو رکی ہوس میں کمی واقع نہ ہوئی تھی یہاں تک کہ لہناں سنگھ لاغر ہونے لگا اور وہ اپنی صحت کی بقا کی خاطر ایک الگ کمرے میں سونے لگا۔

وہ بھی مینے کی پہلی جمعرات تھی جب امرت کو ر ایک بھڑکتے ہوئے چولہے پر کچی ہانڈی چڑھائے اپنے ہضم کے یار کے لیے بڑا گوشت بھونتی تھی اور اُس نے اپنے منہ اور ناک پر دوپٹہ باندھ رکھا تھا تا کہ اُس گوشت کی مہک اُس کے اندر نہ جائے۔ گوشت بڑا تھا اور حلال بھی تھا۔ بخت جہان کو اُس نے آج تک دیکھا نہ تھا۔ لیکن میں بندھی اُس کی گھوڑی اور اُس کی ہلکی ہوئی آواز کے سوا وہ اُسے جانتی نہ تھی۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ چٹکنے سے پرہیز کرتا تھا اور لہناں سنگھ اُس کے لیے خصوصی طور پر رحوبر والے سے فرمائش کر کے کوئی چھچھرا حلال کرواتا تھا اور صرف اُس کا ٹھنڈا ہوا گوشت اُس کے آگے رکھتا تھا۔ اگرچہ اُسے اُس حلال گوشت میں دو ڈالٹہ محسوس نہ ہوتا کہ اُس کے اندر کا سارا خون تو بہا دیا گیا تھا اور خون کا ہی تو ڈالٹہ ہوتا ہے باقی تو سب پھوک ہوتا ہے جیسے ایک بیٹنے کے اندر میں سے گزرنے والے گھنے کارس بہ جاتا ہے اور باقی پھوک رہ جاتا ہے لیکن اُس کے باوجود وہ اپنے یار کا دل رکھنے کی خاطر وہ گوشت چھینوڑتا ہوا نعرہ لگاتا کہ





ہونٹ کسی حد تک زنانوں والے باریک تھے جیسے خریوزے کی دوپٹلی پھاٹکیں ہوں۔ رنگ روپ چاٹنی میں بلوے جانے والے مکھن میں بدلتے گاڑھے دودھ ایسا تھا۔ اگرچہ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، پر لگتا تھا کہ اُس کی پگڑی کا شملہ مچھت کے شہتیروں کو جاپھوئے گا۔ وہ اتادرا زقا مت تھا اور اس کی پگڑی میں سے گردن پر اُترتی بالوں کی ٹہیں نیم شہری تھیں۔ امرت کور پر کوئی ایک قیامت نہ تھی جو نوٹ پڑی، وہ کھلی ہوئی، گھائل ہو چکی چیری گئی۔ پر مضبوط کر گئی۔ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُن قیامتوں کو سہار گئی جو پل دوپل میں اُس پر گزر گئی تھیں اور اُس نے جھک کر نہایت تحمل سے گوشت کی بانڈی اُن دونوں کے درمیان میں رکھ دی۔ جب وہ ہانڈی رکھنے کے لیے جھکی ہے تو بخت جہان کی نیلی آنکھوں کے سامنے اُن کی سطح پر آ گئی۔ گھونگھٹ کے اندر اُس کا ماتھا جو اُس کی آنکھوں کے برابر میں آ گیا تھا وہ بھی نیلا پڑنے لگا۔ عشق کا ہاتھی سندور یا اُسے روند چکا تھا۔ ایک شادی شدہ عورت ہونے کے باوجود وہ تقریباً جوان بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ روندی گئی تھی۔

یہ نہیں کہ بھابی امرت کور کو گھونگھٹ کے اندر رکھنے کی ہانڈی تھا۔ جب اُسے رکھنے کے لیے جھکی ہے اور اُس کا ماتھا اُس کی آنکھوں کے سامنے آیا ہے اور ملل کے دوپٹے کے پار اُسے جو غسل نظر آ رہی ہے تو وہ بے اثر۔ ٹھنڈا ٹھارہ بیٹہ رہا۔ بیکری کی سیلے تو وہی شراب کا کچا پیالہ اُس کے باریک لبوں کو چھونے کو تھا جب وہ اُس کے سامنے جھکی ہے اور وہ پوری کی پوری آنکھوں، رنگ روپ اور نیمین نقش سمیت بخت جہان کے خون میں گھل کر اور پھر اُس کی سطح پر اُبھر کر ایک بادبانی کشتی کی مانند نظر آ رہی تھی جس کے بالوں جانتے تو ایسی ہی تھیں۔ اُس کے بالوں کے پھولیں ٹھانسیں مارنے لگی۔ اُس نے سرمندی سے سر جھکا لیا کہ اپنے بوڑھے یاری خروالی کو گویا ایک بہن ہوئی ہے اور اُس بہن کو ایسی نظروں سے تکتا۔ بے غصہ تھی اور بے شرمی کی انتہا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اُس کی حیات میں بے شمار عورتیں آئی تھیں۔ بہشتی تو جوانیوں کا کھار دیاں اور مضبوط بدن کی ماچھنیں تھیں جن کے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہ تھی کہ بخت جہان ایسے چوہدری نے راہ چلتے انہیں دیکھ کر ایک کھنگور مارا تھا اور ایک سرکوشی میں صرف اتنا کہ کر گزر گیا تھا کہ سوچئے کبھی میری طرف بھی پھیرا تو ڈال۔ اور وہ اپنے خاوندوں اور بھائیوں سے چوری چھپے اپنے من کی مرضی سے اُس کے ہاں پھیرا ڈال دیتیں۔ اگرچہ ایک جاٹ اور چوہدری ہونے کے باوجود کچھ زور زبردستی بھی اُس کے لیے جائز تھی کہ کسی کی مجال تھی کہ وہ بھوں بھی کر جاتا پروہ اُس کا فائدہ نہ اٹھاتا تھا کہ اُسے خود سے مان جانے والی عورتوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ البتہ ایک بار اُس کے یاروں نے اُسے ایک آزمائش میں ڈال دیا۔

جو ہز کا وہ حصہ جو جاٹوں کے چوپال کے عین سامنے واقع تھا خود روٹی سے ڈاکا ہوا تھا اور جب سردیوں کی پہلی بخ بست رات آتی تو اگلی سویر اُس روٹی پر کاسنی رنگ کے سیلنگڑوں کمپوں کے بھول کھلے ہوتے۔ اُس جو ہز کے کناروں پر ایک کچے کوٹھے کے آگے رکھا کھار دین دنیا سے بے خبر اُس جو ہز کی مٹی کو چاک چڑھا کر بھانڈے برتن ڈھالتا رہتا جو اُس کے رزق کا سبب بنتے تھے۔ وہ اُس کے کوٹھے کے سامنے قطار اندر قطار سے





لیے دو کوٹھڑیاں خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کر لی تھیں جس میں اُس کا جیاجت ایک عمرت زدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ جاٹ تھا پر اُس کی زمین نہ ہونے کے برابر تھی اور وہ کمی کینوں سے بھی کمتر سطح پر جیتا تھا۔

تھیمو اس کی سب سے بڑی بیٹی منہ چٹ لگتی اتنی چھوٹی نہ تھی جتنی لگتی تھی۔ مسکین شکل کی بے چارگی اور مصومیت کی تصویر تھیمو کو کونٹھے ٹاپنے پر ملکہ حاصل تھا۔ وہ اس فن میں ایسی ماہر تھی کہ گرمیوں کی راتوں میں کونٹھوں پر خوابیدہ لوگوں کی چار پائیوں کے درمیان میں سے یوں دسے پاؤں گذر جاتی کہ انہیں خبر تک نہ ہوتی تھی اور جب وہ ایک کونٹھے سے دوسرے کونٹھے پر اترنے کے لیے چھلانگ لگاتی تو مجال ہے اس کے پاؤں کی دھمک سنائی دے جائے۔ اس کے پاؤں نہیں بلی کے پنچے تھے۔ تقریباً ہر گاؤں میں ایک دولڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو کونٹھے ٹاپنے کی ماہر ہو جاتی ہیں۔ انہیں چٹا لگ جاتا ہے، مرد کے بدن کا نشہ لگ جاتا ہے اور وہ رہ نہیں سکتیں اور اپنے کسب میں ایسا کمال حاصل کر لیتی ہیں کہ جب چار پائی کے سارے انگ شور برپا کرنے کے درپے ہوتے ہیں تو وہ انہیں ساکت اور خاموش رکھنے پر قادر ہوتی ہیں۔ کسی کچھ پیٹ نہ چلتا تھا کہ تھیمو کب گئی اور کب آئی۔ بھارت بھارت جہان تھا جسے جھوٹو جاتی۔ اس کے اندر ایک جس تھی جو ذرا دل دھمک سے بھی بیدار ہو جاتی۔ بلی دیوار سے کود کر صحن میں دبک جاتی تو وہ اس کے پاؤں کی آواز بھی سن لیتا۔ وہ اس مجسمہ کی شاندار چٹل کود سے بے حد بیزار تھا۔

مجموعہ کی پہلی کتاب "آن دہاؤں میں" کی ایک تصویر ہے۔ اس میں مولانا جاناں سہیل کی تصویر ہے۔

دو تین راتیں تو بے کار گزریں گی۔

تب چوتھی شب جب رات گہری ہو رہی تھی، گل دنیا پور یہاں تک کہ سُننے بھی خواہیدہ ہو چکے تھے.. جو ہڑ سے آنے والی ہوا میں ٹوٹی اور کچھڑکی بلکی سی ہزاروں بوسیدہ مہک تھی، بہت جہان خند سے مغلوب ہونے کو تھا جب اُس کے کانوں کے پردوں پر پاؤں اور کپے کوٹھے کے ملاپ سے جنم لینے والی ایک مدھم سی دھمک ہوئی اور اُس نے پٹ سے سر میں ڈوبتی آنکھیں کھول دیں... جیسو اُس سے کچھ دور اُس کے کوٹھے پر اترنے کے بعد ایک ایسے کھلاڑی کی مانند جس نے ایک لمبی چھلانگ لگا کر اپنے پنجوں پر آرام کر رہا ہو دم رو کے بیٹھی تھی.. منتظر تھی کہ اُس کے چھت پر ٹکوہ دے گا۔ بلکی سی دھمک وجود میں آئی تھی وہ زائل ہو جائے اور وہ بے پاؤں چلتی صرف تین اور کوٹھے ناپ کرتیلیوں کے اُس منڈ کے پاس پہنچ جائے جس کے پاس تیل کے علاوہ اور بہت کچھ جلانے کے لیے تھا..

بخت جہان نے ایک شاطر شکرے کی مانند انگڑائی لی اور چار پائی سے اڑتا ہوا کونٹے پر جا پہنچا اور بچوں پر آ کر  
 کرتی دم رو کے تھیمو کو چاد بوجھا۔ وہ جو دم لینے کو تھی اُس کا دم اٹک گیا اور دوپہی رہی۔  
 جو بڑی جانب سے آنے والی مہک میں جب سویر کی شعلہ گھلنے لگی۔ کونٹوں پر نیند میں مدہوش لوگ اُس شعلہ

تھے۔ مگر اپنے آپ کو کھیسوں سے ڈھانپنے لگے اور حافظہ جی نے ایک لمبا کھنکھار مار کر فحری اذان شروع کی تب جا کر  
جس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی..

یہ شاید بخت جہان کا خیال تھا کہ گرفت اُس نے ڈھیلی کی.. یا شاید یہ جیسو تھی جس نے اُسے ایک لیو کی مانند  
تھکے تھکے نچوڑ لیا تھا..

جیسو کے ناقواں باپ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا جب بخت جہان نے اگلے دن اُس کی بیٹی کا رشتہ مانگ  
لیا۔ جس کا جواب ملنے کا گھلارہ گیا کہ اُس کے تو بھاگ جاگ گئے تھے اور اُس کے ہونٹوں سے رال بہہ نکلی..

بخت جہان نے اُسے سب سے پچھلی کوٹھڑی میں قید کر دیا.. جیسو تیرے کوٹھے ٹاپنے کے دن گئے.. اب اگر تو  
میرے کوٹھے تک جاتی سیر میوں پر بھی قدم رکھا تو مجھے قسم ہے اپنی بہشتن ماں کی کہ میں تمہارے وہ پاؤں نوکے سے کاٹ  
کر کھسکے۔ کچے پر چڑھا کر اُن کا سالن بنا کر نہ کھا جاؤں تو میرا نام بھی بخت جہان نہیں..

لوگوں کے ذہن میں سوال اٹھتا تھا کہ جیسو کیسے ہو گیا کہ وہ بخت جہان کے قہر کی وجہ سے نہیں کرتے تھے کہ اُس  
کی ایک تارہ مزاج عورت بخت جہان کی بیوی کی جس سے گاؤں کا ہر دوسرا نوجوان خطا کرتا تھا۔ اُس کا جواب یہی ہے کہ  
جیسو نے جسے شریک بنو بھری، قمریشی اور گیلانی اور سید بادشاہ بازاری، طوائفوں اور رنڈیوں سے کیوں شادی کر لیتے ہیں...  
بخت جہان کی زندگی کی کوئی ایسی رمز ہوتی ہے۔ کوئی کارکردگی ایسی ہوتی ہے کہ مرد اُسے اپنے گھر میں ڈال دیتا ہے..

وہ ایک ایسی عورت تھی جس کے ساتھ کوٹھے باقی غائب ہوئی.. وہ موچی شاید گاتھنے میں بہت ماہر تھا..  
بخت جہان کی بیوی اُسے چھوڑ کر کسی جاٹ کے ساتھ بھی نہیں ایک موچی کے ساتھ فرار ہو گئی..

بخت جہان کی بیوی اُسے چھوڑ کر کسی جاٹ کے ساتھ بھی نہیں ایک موچی کے ساتھ فرار ہو گئی..  
بخت جہان کی بیوی اُسے چھوڑ کر کسی جاٹ کے ساتھ بھی نہیں ایک موچی کے ساتھ فرار ہو گئی..

جیسو کی یکدم گمشدگی کے طوفان نے ایک بخت جہان کو اپنے گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ ایک لڑکی سے شادی کر لی..  
جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے

جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے  
جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے

جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے  
جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے

جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے  
جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے

جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے  
جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے

جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے  
جیسو نے اپنے گھر سے بہت دور اپنے تخت ہزارے میں رہتے تھے اور بخت جہان کی شہرت اور قبر سے واقف نہ تھے.. اس لیے







”خس و خاشاک زمانے“

ایک منسلے کے گھر چلی جائے۔“

”جہانیاں! تو مجھے قبول کرتا ہے کہ نہیں؟“

یہ افیون کا کچھ کرشمہ نہ تھا۔ امرت کو رنج آئے اپنے بیٹوں سمیت اُس کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

”آہو امرت کورے۔“ یہ حقیقت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی یہ کوئی واہمہ تھا۔ وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

امرت کورنے یہ اقراء دن کر چوکھٹ کے اندر صحن میں قدم رکھا اور بخت جہان پر اُلٹی ہوئی بولی ”جہانیاں آؤ  
کے بعد اگر ٹوٹنے کسی اور دن کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو سونہ واہ گرد کی۔ میں اپنے ہاتھوں سے تیرے ذکرے کر  
دوں گی۔“

اُس محلہ مغربی میں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جاٹ مسلمان تھے، ایک مسجد بھی تھی جس کے امام وہی  
ایک چشم حافظ جی تھے، انہیں فوری طور پر طلب کر لیا گیا۔ حافظ جی نے لکارا مارا اور حافظ جی کی رُوح نہ  
ہوئی ”اس سوانی کے ساتھ تیرا نکاح پڑھا دو۔“

انہوں نے اپنی ایک محفوظ آنکھ کو متعدد بار بھپکایا اور انہوں نے دیکھا کہ اُن کے سامنے اُس وحلی دو پہر میں  
ایک وحلی چڑکی کسے ہوئے بدن والی عورت ہے اور اُس کے دائیں بائیں دراز قامت بڑے چتھے اور کڑ چتھے دو سکھ مرد  
موجود ہیں۔ اُن کے پاس ایک بڑا سا گھڑا ہے۔ اُن کے پاس ایک بڑا سا گھڑا ہے۔ اُن کے پاس ایک بڑا سا گھڑا ہے۔  
”آہو۔“

وہاں کے ساتھ تیرا نکاح نہیں ہو سکتا۔ ”شرعی مسئلہ تھا اور حافظ جی اس پر مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔  
”پر کیوں نہیں ہو سکتا۔“ بخت جہان۔ حافظ جی کو گھوٹی یا ہویا کے لقب سے گوازنے لگا تھا پر لحاظ کر گیا۔ ”اسے  
سکھنی رہنے دے۔ تم نکاح پڑھاؤ۔“  
”شرعی طور پر ایسا ہو نہیں سکتا چوہدری۔“

”میں نے تم سے پوچھا ہے کہ یہ شرع کیا ہوتی ہے حافظ جی۔ ہر روز میرے گھر سے تمہارے ہاں جو روٹیاں  
جاتی ہیں، جمہرات کی جمہرات ملو جاتا ہے، وہ کبھی پوچھتا ہے کہ شرع کیا ہے۔“  
”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ حافظ جی جو ایک درویش طبیعت کے صلح کن شخص تھے، بہر طور اُن روزانہ کی روٹیوں  
اور جمہرات کے حلوے کے پابند تھے، انہوں نے نکاح پڑھانا شروع کر دیا۔

پیار کے چچھے ایک نیم تار یک کونٹری میں بھاگ بھری کے کانوں میں یہ سب کچھ اتر رہا تھا اور اُسے اسی لمحے  
کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹوں بچوں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

حافظ جی اپنی جھولی میں گڑ شکر اور گندم سنبھالتے ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے۔ مگر امرت کو ر کا اسلامی ہم  
کنیز فاطمہ تجویز کر کے چلے گئے۔

پر اُس حالیہ کنیز فاطمہ کی کمر کے ساتھ۔ چمٹے ہوئے جو دو سکھ نوجوان تھے اب ان کا کیا کیا جائے۔ وہ بہت

کھانے کھانے سے اپنی ماں کو منکوحہ ہوتے دیکھتے رہے تھے اور کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ یہ کیسے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔  
 جنت جہان نے قریب ہو کر ان کی ڈھارس بندھائی۔ ”تم آج سے میرے سگے ہو۔ بے شک سردار ہو، مجھے کچھ اعتراض نہیں۔“

وہ جو گو بند تھا، اپنے جڑواں بھائی نوہال سے ذرا اتنا سائینٹر تھا کہ اُس نے پہلے اپنا سر نکالا تھا، وہ سر جھکا کر کہنے لگا۔ ”چاچا اگر بے بے مسلم ہو گئی ہے تو ہمیں بھی کر لو۔“

اب بخت جہان کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ ایک سردار کو مسلا کیسے کر لیتے ہیں۔ اُس نے حافظ جی کو پھر سے دھڑکاتے کر دیا۔ اور وہ ایک آنکھ پیچے پھر سے حاضر ہو گئے۔ اگرچہ وہ اب گلو کی دو ڈلیاں کھانے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ صحن اور شانت ہو چکے تھے۔

”حافظ جی یہ دونوں.. یہ گو بند سنگھ ہے اور اس کا نام نوہال ہے۔ یہ میرے بیٹے ہیں۔ ان کی ماں میری منکوحہ تھی۔“  
 ”تو ان کو بھی مسلمان کر لو۔“  
 ”کیسے کر دوں؟“ حافظ جی ذرا بوکھلا گئے۔

”تم مولائی صاحب ہو، تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ کسی بندے کو مسلمان کیسے کرتے ہیں۔“  
 ”اوہ چہ ہدری پتہ مجھے نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا پر ان کی مرضی بھی پوچھی سے کہ نہیں کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں

UrduPhoto.com

ہوگا۔ اُس وقت چوہے کے قریب حسب عادت ماں کے گھٹنوں سے لگے بیٹھے تھے۔ ”مجھے ان کی شکلوں سے تنگ رہا ہے۔“ وہ بھونچا دیکھ کر پان گھونپ دیں تو۔ یہ کام تو کسی اور سے کرائے۔“

حافظ جی کو دراصل کچھ شہر ایک نہایت ہی ناخوشگوار تجربہ ہوا تھا۔ اُن دنوں اُن پر تبلیغ کا بھوت سوار تھا۔ انہوں نے کشمیری بازار لاہور سے جو کچھ سیکھا تھا وہ سب کچھ ”نہایتی“ نامی کتابچے کو پڑھ لیا تھا جس میں کچھ مضامین بزرگان دین کے قول وریج تھے اور اُن میں ایک پتہ نہیں کوئسے بعد ادوی بزرگ نے فرمایا تھا کہ ایک شخص جسے تنگ و غمور میں جتنا رہے، گناہوں سے آلودہ رہے اگر وہ کسی کا فرقہ و گمراہی سے تعلق رکھتا ہے تو نہ صرف اُس کے تمام گناہ عطا کیے جائیں گے بلکہ اسے جنت کے سب سے بالائی حصے میں دیگر جنتیوں کی نسبت دو گنی خوریں عطا کی جائیں گی۔ چنانچہ حافظ جی نے ایک روز ٹھیکہ چیمے کے ایک سردار کو جالیا اور اسے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا۔ اس پر سردار اپنی گھوڑی سے اتر کر پان نکال کر حافظ جی کی شہرگ پر رکھی اور کہنے لگا۔ ”اب بول مولوی اب کیا پڑھوں؟“ اس پر حافظ جی نے کھینچتے ہوئے کہا۔ ”سرداری ایک تو آپ میں جس مزاج نہیں ہے، میں تو محمول کر رہا تھا۔“

تو حافظ جی قابل فہم طور پر سکھوں کو مسلمان بنانے سے بدگتے تھے۔  
 ”کوئے کڑی یا ہو۔ ادھر آؤ ماں کے خصمو۔“ وہ دونوں ماں کے گھٹنوں سے الگ ہو کر اپنے نئے باپ کے پاس کھڑے ہوئے۔ ”اوئے تم نے مسلمان ہونا ہے کہ نہیں۔“

”ہونا ہے چاچا۔ ہمیں کر لو۔“



”کرو جی حافظ جی..“

”تو پھر پڑھو بسم اللہ..“ حافظ جی اس اقرار سے دلیر ہو گئے.. انہوں نے کلمہ دوہرایا.. گو بند اور نو نہال کی سمجھ میں ظاہر ہے، کچھ نہ آیا پرائیوٹیوں نے اپنے حساب سے کچھ دوہرا دیا..

جاتے جاتے حافظ جی نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا.. ”چوہدری“ انہوں نے اپنی ناکارہ آنکھ میچ کر اور کارآمد آنکھ ذرا کھول کر کہا.. ”یہ تختے بیٹھے ہوئے ہیں؟“

”ہیں؟“ بخت جہان نے بوکھلا کر ان دونوں کے تہبندوں کی جانب دیکھا جیسے وہ ان کے پار دیکھ کر بتا سکتا ہو۔ پھر اُس نے ذرا طیش میں آ کر کہا ”ضروری ہے؟“

”بہت ہی ضروری ہے.. ایک مسلمان کا طرہ امتیاز یہی ہے چوہدری..“  
”پر یہ طرہ نہ ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی نے ان کڑیٹھے جوانوں کے تہبندوں میں جھانپتیاں مار کر پتہ کرنا ہے کہ بیٹھے ہیں کہ نہیں..“

”تیری مرضی ہے چوہدری.. پر ایک بات میری ٹھٹھ کے پٹے باندھ لے.. تو بنا شک روزانہ مجھے گندم کی روٹیاں دیتا ہے۔ جمہرات ملوہ بھیجتا ہے جس میں بیٹھا ہمیشہ کم ہوتا ہے پر کل کلاں کو کھٹان کے بیاہ کرنے پر ناں تو میں نے ان کا نکاح نہیں پڑھنا کیونکہ میں تو جانتا ہوں ناں کہ یہ منہ زبانی مسلمان ہوئے ہیں جبکہ بیٹھے سے ابھی تک سردار ہیں..“

UrduPhoto.com

”اگر کسی ذرا استویشناک تھی، وہ جانوں کے اس محلے کے واحد مولوی صاحب تھے اور ایک مدت سے تھے، ان کے سارے غریبے نہلاتے تھے اور سارے نکاح وہی پڑھتے تھے.. بخت جہان نے ذرا منت سلجھائی، دانے ڈنکے کے دعوے کیے پر حافظ جی ڈھنچے رہے۔ وہ بے شک دین مذہب کے معاملے میں جانوں کو تو دعویٰ بہت چھوٹ دیتے رہتے تھے پر یہ معاملہ ذرا زیادہ شرعی اور بنیادی نوعیت کا تھا..“

”یہ منہ زبانی مسلمان ہوئے ہیں جبکہ بیٹھے سے ابھی تک سردار ہیں..“

”نکاح پڑھ دیتا ہوں پر اگلی صبح کل عالم کو علم ہو جائے گا کہ یہ تختے نہیں بیٹھے ہوئے.. وہ والا کام جوں کا توں ہے..“

”پر کیسے..“ بخت جہان کا جی پا رہا تھا کہ وہ حافظ جی کی کارآمد آنکھ بھی پھوڑ دے.. ”اگر تو نہیں بتائے گا تو کل عالم کو کیسے علم ہو جائے گا..“

”جس کو بیاہ کر لاؤ گے ناں وہ بیہودہ.. اگلی سویر دوپائی دے رہی ہوگی کوٹھے کی چھت پر کھڑے ہو کر کہ لوگو.. دے لوگو..“

راستے میں ایک ایسی دیوار آگئی تھی جسے انسان پہنچا نہ کر اگر دوسری جانب چلا بھی جائے تو وہاں ایک ٹوہڑا دولہن کوٹھے کی چھت پر سر پر ہاتھ رکھے دوپائی دے رہی ہے کہ لوگو.. دے لوگو.. وہ والا کام جوں کا توں ہے..

شام اترنے سے پہلے پہلے امرت کور، حالیہ کنیز فاطمہ نے اُس حویلی نما گھر کے سارے انتظامات سنبھال لیے تھے.. قائم دین مصطفیٰ جو سر شام تین بجیں تو کا دودھ دودھ کر کنویں سے چننا دودھ بھری گاگر چھلکا تا، آدھے دودھ سے گاگر

تھیں میں چھڑکاؤ کرتا حویلی میں داخل ہوا تو کثیر فاصلہ نے آگے بڑھ کر دودھ کی گاگر اس کے سر سے یوں اتاری جیسے  
 جال سے مینا کرتی آتی ہو۔ دودھ چانی میں اُنڈیل کر اس نے اسے اُپلوں کی سلگتی آگ پر چڑھا دیا۔ تینوں گھوڑیوں  
 تھیں تھیں سختی کو چار اڑا اڑا۔ لائین روشن کی اور بانڈی چوہے پر رکھ کر آنا گوندھنے لگی۔

یہ تمام تر معمولات ہو ہو رہاں سنگھ کے گھر والے تھے کہ جانوں کے شب و روز میں کچھ زیادہ فرق نہیں  
 تھا۔ بے جیسا کہ وہ ہر شام بیٹھتے تھے اپنی ماں کے گھٹنوں کے ساتھ لگے بیٹھے اس سے لاڈ کر رہے تھے۔  
 ان کے لیے بھی کچھ نہ بدلاتھا۔ سوائے باپ کے اور وعرم کے۔

دینونائی منہ اندھیرے بیدار ہو کر اپنا تاریختی اُستر اسان پر لگا تا تیز کر رہا تھا۔ یہ وہی قدیمی اُستر تھا جو اس نے  
 بچپن میں شتر امین آباد کے جیسا کھی کے میلے میں سستے داموں خریدا تھا۔

ایک بڑے جوش بھنگڑا ڈالتے تھے۔ گھوڑوں میں گم ہو گئے تھے۔ ایک دوکان کا کوئی جواز نہیں بنتا پر  
 تھے تھ کہ چند جوانی کے گم ہون میں بدست مسلمان نو جوان جاٹ وزیر آباد سے پانچ سات تیز دھار اُسترے خرید  
 تھے۔ جب مسلمان جوان پر آ جاتا تو وہ سکھ نو جوانوں کو لکارتے اُسترے لہراتے میدان میں آ جاتے۔ سردار و آج  
 تھے۔ اس اُسترے سے تمہاری واڑھیاں صفا چٹ کر رہی ہیں۔ کیس کاٹ دینے ہیں۔ جہاں کہیں بھی تمہارے بال ہوتے

UrduPhoto.com

تھے۔ یہ اُسترے چوہدری شہزاد اور دل گئی کی خاطر لہرائے گئے تھے تو اس بے لگے کے بعد انہیں ناکہ بوجھ کر جو کوئی بھی  
 خریدتا تھا اسے کوڑیوں کے عوض فروخت کر دیے جاتے۔

تو وہی پانچ برس پرانا کوڑیوں کے عوض فروخت کر دیا۔ وہی کوڑیوں کے عوض فروخت کر دیا۔ وہی کوڑیوں کے عوض فروخت کر دیا۔  
 صرف اس نے اپنے چوہدریوں کی واڑھیاں مونڈھی نہیں بلکہ اپنی گدھی کے لیے چار بھی باقاعدگی سے کاٹا تھا۔

دینو کے اُسترے کے چلنے کے بعد چوہدری حضرات کے گاؤں پر کپاس کی ایک فصل کے بچا ہے بہار دینے  
 تھے۔ بچا ہے کے نیچے ایک گھاؤ ہوتا اور دو چھاپے سرخ ہوتے جاتے۔

آج دینونائی کے اس اُسترے کا امتحان تھا۔ اس نے دوسرا دن کے تختے گرنے تھے۔  
 اس دینو کے بھتی باپ اللہ رکھے نے چوہدری بخت جہان کے تختے کیے تھے۔

بخت جہان کو یہ المیہ کچھ کچھ یاد تھا۔ یہ یاد تھا کہ وہ یکدم مختصر ہو گیا تھا۔ وہ تو صرف تین برس کا تھا جب یہ وقوعہ ظہور  
 پانچ سو تھا اور اللہ رکھے نے اسے دو اینٹوں پر بٹھا کر کہا تھا۔ اوپر دیکھو۔ ایک جیل گدھا اٹھائے لیے جا رہی ہے اور جب

اس نے اوپر دیکھا تو نیچے سے اس کا کام تمام ہو گیا تھا، پر یہاں معاملہ کچھ پیچیدہ تھا۔  
 وہ دونوں تین برس کے نہ تھے اور انہیں دو اینٹوں پر بٹھا کر نیچے نہیں دیا جاسکتا تھا کہ اوپر دیکھو۔ اس عمل کے لیے

ایک لگ تھائی ورک تھی جس کا گاؤں میں کچھ تصور نہ تھا۔ سردیوں، گرمیوں میں کبھی پسار کے اندر اور کبھی چھت پر سب کی۔

ماؤں، بہنوں... باپ کی... بہو کی... بیٹی کی چار پائیاں قطار اندر قطار بچتی تھیں اور اس کے باوجود بچہ باقا عدد کی سے بچے ہوتے چلے جاتے تھے کہ برابر کی چار پائی کے پائے اگر لرزش میں آتے تھے تو درگزر کر دیا جاتا تھا تو ایک مکمل الگ تنہائی کا ان زمانوں میں کچھ تصور تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ گو بند اور نونہال کو کہاں ایک ایسی الگ تنہائی میں بٹھایا جائے کہ وہ یونانی کا اسٹرکام نہ دکھا جائے۔ کہاں؟

صرف مخرولی کے بجز ولے تھے۔ کچھلی اندھیری کوٹھڑیوں میں جن کے اندر جناس کا ذخیرہ کیا جاتا تھا۔  
دینونائی نے باری باری۔ پہلے گوہند کو اور پھر نوہال کو ایک چٹائی بجز ولے میں اتارا اور پھر خود اتر کر اپنے قدمی  
استرے کے بھرپور وار کر کے اُن سروار بچوں کے خضنے کر دیئے۔

اُن کی ہولناک چھینیں مجھ رولوں میں سے برآمد ہو کر پورے گاؤں کو پکارنے لگیں۔ اور خون اتنا بہا کہ خبر وے  
 سُرخ ہو گئے۔

دینونانی بحر و سلاطین سے اٹھا، اپنا خون آلود اُسٹر ایک جہادی کی تلواری پہنچا دیا۔ اتنا اٹھا اور بخت جہان نے نہ صرف اُس کی جھولی آجنا س سے بھر دی بلکہ اُس کی ہتھیلی پر چاندی کا ایک روپیہ بھی رکھ دیا۔ کام مکمل ہو چکا تھا۔ نو مہال سنگھ غلام محمد ہو چکا تھا اور گوہر بند سنگھ فتح محمد۔

UrduPhoto.com

”یہ بھاگ بھری کہاں دفغان ہوئی ہے.. میرے بچے بھی لے گئی ہے..“

”یہ بھاگ بھری کہاں دفنان ہو گئی ہے، میرے بچے بھی لے گئی ہے۔“





ایک مرد اور وہ بھی 1930ء کے لگ بھگ زمانوں کا مرد، ایک تہذیب سے چھڑے ہوئے گاؤں میں حیات گزارنے والا اور مستزاد یہ کہ ایک جاٹ مرد۔ تو اُس کی انا اُس کے قد سے بھی بلند ہوتی ہے اور اگر وہ دراز قامت بخت نہیں ہوتا اُس کی انا تو عرشوں کو جا چھتی ہے اور ایسی انا کی سی سی ہوتی ہے اسے کتنی بے حساب طمانیت حاصل ہوتی ہے اگر ایک عورت نہ صرف اُس کے عشق میں فنا ہو جائے بلکہ اپنا گھر یا رخاوند سب کچھ چھوڑ چھا کر اُس کے در پر آ جھکے۔

ایسا کہ تو ایک مست باغی کی طرح جھوٹے لگتا ہے کہ مجھ میں وہ کشش ہے کہ میں بھرے نہ بھرے گھر آ جاؤں سکتا ہوں۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی بات کہتا ہو اور اس کی بات سن کر دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔ یہاں تک کہ اسے بخت جہان کو اصول تو اپنی مردانہ چاہت پر ناز ہونا چاہیے تھا کہ امرت کور نے اُس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ یہاں تک کہ اسے اس امرت ہو گیا تھا۔ جس لیے امرت کور نے اُس کی چوٹ کو پار کیا تھا اُس کے بعد اب تک اسے ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب اس نے اپنے آپ کو مطمئن نہ کیا ہو۔ اپنے آپ کو دنیا کا مکمل ترین اور اخلاق کی عمیق ترین شخصیت میں گرا ہوا بے غیرتی کے پتھر میں اتار دیا۔ یہ شخصیت اس کی بخت جہان جو یاروں کا یا ایک شخص تھا اسے شہید احساسِ جرم نے پھانسی کر رکھ دیا تھا۔ بے شک وہ بھی گرفتار ہوا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عشق آتش کے شعلے ہیں اور دوستیاں پتھل کر پانی ہو جاتی ہیں پر لہناں سنگھ تو مذہد قدیم سے اُس کا بیلی اور جگری یار تھا۔ اس کی تباہی و بربادی کے میلے میں جب وہ دونوں لگا کرتے ہوئے داخل ہوتے تھے تو ایک لمحے کے لیے تو پورا میلہ بے حس و حال ہو جاتا تھا۔ جھوٹے رُک جاتے تھے۔ ڈھول خاموش ہو جاتے تھے اور بولیاں بولنے والے بولیاں بھول جاتے تھے۔ کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ اُن کے ساتھ ڈانگ سونا کر سکے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بنا ہوا تھے۔ جیسے دینے والے۔ ایک دوسرے کی عزت کے رکھوالے تھے۔ راہ چلتے ہوئے اگر بخت جہان کو شاید بھی ہوتا کہ بھٹکے درخت میں کسی پرندے کی ٹوک میں لہناں سنگھ سے ناپسندیدگی کی جھلک ہے تو وہ اُس درخت پر چڑھ کر اُن پرندے کی جان لے لینا چاہتا تھا۔

تو اس بے غیرت بخت جہان نے اپنے یار لہناں سنگھ کے گھر پر ہی ڈاکہ ڈال دیا تھا۔ آئی تو وہ اپنی مرضی سے تھی کہ اس کی جگہ بڑا تھا کہ وہ اسے بھگا کر لایا ہے۔



تہہ ہاتھ سے گتھا کیا اور یوں بولا جیسے خمار میں نہیں ایک خواب میں بولتا ہو، جہانیاں... دُن، تلوار اور گھوڑا کسی کے گئے نہیں  
 جتے کسی سے وفا نہیں کرتے.. ان کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا.. اُس گھوڑے پر کیا سواری کرنی جسے تمہارا وجود بوجھ محسوس  
 ہونے لگے.. اُس تلوار کو نیام میں کیا رکھنا جو تمہارے ہاتھ میں تو ہے اور خود بخود دوار نہ کرے.. اور گھوڑے کی طرح ہی دو دُن  
 بھی کس کام کی جسے تمہارا وجود بوجھ لگنے لگے... ان تینوں کو اگر وہ تمہارے پاس نہ رہنا چاہیں تو کھلا چھوڑ دو.. انہیں آزاد کر  
 دے حال اُن کا جی چاہے جانے دو.. انہیں اپنی انا کی دیوار سے روکنے کی کوشش مت کرو، جانے دو.. جہانیاں، گھوڑے بھی  
 بہت تواریں بھی بہت اور زلوں کی بھی کچھ تھوڑ نہیں.. البتہ یاروں کی بہت تھوڑ، بہت کمی ہوتی ہے.. تو چھٹا نہ کر.. اپنے  
 سے من جرم کو بھول جا اور گا مومکبار کے کچے پتے چنگ.. شیشہ پیالے میں سے شراب کا ایک اور گھونٹ بھر.. دُن، تلوار اور  
 تھیں آج تک کسی کے نہیں ہوئے.. تیرے بھی نہیں ہوں گے..

UrduPhoto.com

خواب صورت لوگوں کی سرزمین



موج بچوں کی تھی..

محمد جہان نمرودار کے کھودے جانے والے کنویں میں سے نکلنے والی مٹی کے انباروں پر وہ اپنے آپ کو سنبھالتے.. کنویں میں گرنے سے بچانے سری سویر سے شام ڈھلنے تک تقریباً چھوٹے بچے سے بیٹھے اُس کی گہرائی میں اشتیاق اور اُمید سے جھانکتے رہتے.. کہ اُن کے یوں مسلسل پہرا دینے کا جھانکنے کا ایک سبب تھا.. ایک خاص گہرائی تک مزدوروں سے مٹی کھدوانے کے بعد وہ دونوں کرم داد اور مولاداد اُس گہرائی میں اُتر گئے.. ایک چھتری کے ساتھ مٹی کا دھاگا باندھ کر اور اُس چھتری کو درمیان میں گاڑ کر دھاگے کی مدد سے ایک دائرے کا تعین کیا.. پھر اُس مٹی میں ایک ایک اینٹ ڈرا کر پچھلے رُخ پر لگا دیں.. دھندلے اور پھولے ہوئے اینٹوں کے ساتھ ایک ایک اینٹ ڈالیں.. یہاں تک کہ ایک گولا کی ابھرتی گئی اور کنویں کی ابتدائی ہیئت دکھائی دینے لگی..

یہ کنویں کی گولا کی ابتدا تھی..

اور اس ابتداء پر کھدوانے کی چٹائی کرتے اینٹوں کا یہ دائرہ روز بہ روز بڑھتا چلا گیا.. یہاں تک کہ ایک سر بریدہ مینار کی مانند سطح زمین میں سے نمودار ہو کر کھدوانے والوں کی پہچان کی.. کھدوانے کے سامنے ظاہر ہونے لگا اور پھر اُن سے بھی اونچا ہو گیا..

اور اس کے بعد جو ظہور میں آیا اُس پر بچے تو کیا محمد جہان خود اور اُس کی برادری بھی یقین نہ کر سکی..

کرم داد اور مولاداد پھر سے کنویں کے اندر اُتر گئے اور مزدوروں کی بجائے وہ دونوں خود ایک خاص حساب کتاب سے اینٹوں کی بنیاد تلے کی مٹی کھودنے لگے.. اور پھر بہت آہستگی سے اُن کے کھودنے سے جو غلاء وجود میں آیا تھا.. اُس کے اندر اینٹوں کا وہ گول سر بریدہ مینار دھنسنے لگا یہاں تک کہ وہ اُس میں دفن ہوتا سطح زمین کے برابر آ گیا.. انہوں نے کھدائی روک دی..

پورے دنیا پور میں ہی نہیں آس پاس کے سب دیہات میں جیسے منادی کر دی گئی ہو ایسے ہر ایک کو خبر ہو گئی کہ اینٹوں کی گولا کی تہہ تک دھنس چکی ہے اور کل انہوں نے جو کنواں کھودنے کے ماہر ہیں انہوں نے کل سویر کنویں میں اُتر کر تہہ کی گیلی مٹی پر چند کد الیس چلائی ہیں اور اُس میں سے پانیوں کے ٹخمرے اُٹھنے لگیں گے اور وہ اس کنوارے کنویں کو لبریز کر دیں گے.. اگر وہاں پانی ہوئے تو..

لکھن عالم کو علم ہو گیا کہ کل سویرے۔۔۔

...سوریل بل چلانے والوں نے بل تھپوڑ دیے...

چانیوں میں دودھ بلونے والی جنیوں نے مدھانیاں روک کر رڑھ لٹکا ترک کر دیا۔ فجر کی اذان بلند کر کے دعوت گروانے کے بعد سلام پھیرتے ہی حافظ جی اپنی ایک گارآمد آنکھ سے راستہ تلاش کرتے محمد جہان کے گھر کی جانب چل دیئے اور محمد جہان کی گھر والی بہشت بی بی جو شرکیوں کے طعنے سن سن کر تنگ آ چکی تھی کہ ذرا دیکھو کہ تم کا گھر کھاس کھا گیا ہے ایک ویرانے میں کنواں کھدوا رہا ہے۔ اپنے کنگ کے بھڑولے خالی کر رہا ہے۔ اول تو وہاں سے پانی نکلے گا ہی نہیں اور اگر نکل آیا تو اُس سے فائدہ۔ اُس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اور آخری اولاد ایک دس برس کے بچے کو جہان کو سننے کپڑے پہنائے اور کنویں کی جانب روانہ ہو گئی کہ اُسے ہمیشہ سے یقین کامل تھا کہ اگر محمد جہان اپنا سب کچھ لو کر اُس ویرانے میں ایک کنواں کھدوا رہا ہے تو اُس میں حکمت ہے اُس میں سے پانی ضرور نمودار ہوں گے اور۔۔۔

آس پاس کے درختوں، پتھر کوٹ، نت کلاں... چینگا چیمہ کی جانب سے بھی لوگوں کے ٹھنڈے کے ٹھنڈے چلے آتے

دنیا تو اس سویرے تقریباً ویران ہو گیا۔

[illegible]

اُسے خیال ہی نہ رہا تھا، محمد جہان جس بے چینی اور ذہنی تناؤ کا شکار تھا اُس نے اُسے بھلا دیا تھا کہ کنویں کی کھدائی کرنے کے لیے حافظ جی کو سدا بھجنا ہے اور وہ بھلے مانس خود ہی چلے آ رہے تھے بن کلائے۔ ایک ہجوم اُٹھ اُٹھ کر محمد جہان پرے پرے کرنا حافظ جی کا شکر گزار ہوتا انہیں کنویں کے کنارے پر لے گیا اور اُن کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اُن کی ایک آنکھ کی کمی کو جانتے ہوئے احتیاط کرتا تھا کہ کہیں حافظ صاحب اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پڑھتے ہوئے کنویں میں لڑھک نہ جائیں۔

انہوں نے کنویں میں سے برآمد ہونے والی مٹی کے ڈھیر پر بمشکل کھڑے ہو کر جب سر جھکا کر ہاتھ باندھے

کی آل اولاد کی سلامتی اور خوشحالی کی دُعا کی۔

جونہی ”آمین“ کی گونج معدوم ہوئی کرم داد اور مولاد لنگوٹ باندھے ہوئے آخری بار کنویں میں اتر گئے۔ پھر بچا جو جاٹ کے باغ کی مینڈھوں پر لگائے دیسی گلاب کی جھانڑیوں سے حاصل کردہ پھول پھینکے گئے۔

اُن کے کنویں میں اترتے ہی ہر سونانا چھا گیا۔ گہرائی میں وہ دونوں ایک نیم اندھیرے میں کدالیں چلاتے تھے۔ اُن کی ہولے ہولے ٹھٹھک ٹھٹھک کرتی آواز اور پر سطح تک آتی منتظر لوگوں کے دلوں پر لگتی دھک دھک کرتی تھی۔ وہ سر تو کنویں کے گرد جھوم کرتے تھے پر محمد جہان ان سے پرے گھنے کے ایک کھیت کے قریب ایک مینڈھ پر بیٹھا ایک عجیب سوگاری میں ایک مولے پونے گھنٹے کا چھلکا اپنے مضبوط دانتوں سے اُتارتا تھا پر اُس کے اندر سے ظاہر ہوتی سفید مٹاس کے گودے کو پکڑتا تھا صرف چھلکا چھیلتا جاتا تھا کہ اُس کے اندر ایک اضطراب تھا جسے وہ مٹا چھیلنے کے عمل میں بھل جانے کی سعی کر رہا تھا کہ۔ اگر پانی نہ برآمد ہوئے تو۔

ہر کھودے جانے والے کنویں سے اندر سے پانی نہ نکلتا تھا۔ یا تو پانی اتنی گہرائی میں ہوتے کہ اُن تک پہنچنا ممکن نہ ہوتا اور یا پھر حساب کتاب میں کچھ غلطی ہو جاتی۔ اُس برس پانچ میں سے تین کھودے گئے کنویں ایسے تھے جن میں سے پانی نہ نکلتا تھا اور اُن زمینداروں کی جنہوں نے ان کے کھودانے اور تعمیر پر اپنی جمع پونجی صرف کر دی تھی اُن کی کل حیات اجاشا کا رستہ گیا تھا اور اُن میں سے ایک مجذوب ہو کر قبرستان میں جا بیٹھا تھا۔

اگھوٹی آنکھیں جو کنویں کی گہرائی میں اترتی اور پانی سے بھیک گئی ”اوئے لوگو“ انہوں نے شور مچا دیا ”پانی“ کنویں کی تہ میں جو کچھ تھا، اُس میں سے ان دونوں کی کدالوں کی مسلسل ضربوں سے۔۔ کچھ بلبلے اُٹھتے گئے اور پھر یکدم وہ بلبلے ایک شفاف صاف ستھرے پانی کے فوارے میں بدل گئے۔ اور وہ پانی اُٹھتے تھے اور بے قابو ہونے جاتے تھے۔ انہوں نے کنویں کی تہ کو دیکھ کر حیرت مندی ہوئے تھے۔ وہ دیکھ سکیں کہ اُسے بھرنے لگے، اونچے ہوتے ہوئے یہاں تک کہ کناروں پر بیٹھے ہوئے لوگ جھجک کر ذرا پیچھے ہونے لگے کہ کہیں یہ پانی جو اتنے بے مہار اونچے ہونے چلے آتے ہیں، ہمیں بہا کر نہ لے جائیں۔

اور اُن پانیوں میں کرم داد اور مولاد ابھی پر مسرت چھٹیں مارتے ڈبکیاں لگاتے بلند ہوتے کناروں کے قریب آ رہے تھے۔

محمد جہان نے حافظہ جی کی اس صدا پر کہ۔ اوئے لوگو۔ پانی۔ گھنے کے گودے میں اپنے دانت گاڑے اور اُسے ہونٹوں میں دبا کر اُس کا سارا زس اپنے گھنے میں اُتارا اور مسکرانے لگا جیسے مہاتما بدھ نروان حاصل کرنے پر۔ ایک راہبہ بی بی مریم کو خواب میں دیکھنے پر، ایک میرا کرشن کی شکل دیکھنے پر اور ایک سوہنی مہینوال کو دریا پار کر کے آنے پر دیکھتی ہے۔ اور مسکراتی ہے ایسے وہ مسکرایا کہ اُس کا خواب مکمل ہو گیا تھا۔

اگرچہ وہاں بچوں کی موج تھی۔

لیکن بہت سے بڑے بھی اُن کے اشتیاق میں شامل تھے۔



وہ سب کے سب صرف کنویں کی تہہ میں سے نکلنے والے پانیوں کو نکلنے نہیں آئے تھے ایک اور سبب بھی تھا۔ اگر وہ ہر روز بلا ناغہ سارا سارا دل و ہاں بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے تھے، جھانکتے رہتے تھے تو پانیوں کے لیے تو کبھی سب ایک اور تھا۔

ان سب کے اندر مذہب قدیم سے ایک دکانت ایک روایت چلی آتی تھی جو سینوں میں سفر کرتی چلی آتی تھی۔ کہ جب کبھی کہیں بھی ایک کنواں کھودا جاتا ہے۔ کھدائی ہوتی ہے تو اُس روز جب اُس کی تہہ میں سے پہلے پانی اُچلتے ہیں تو یہ سب سیرا کرنے والی مخلوق.. بولنے.. انسانی شکلوں والے باشندے بھر کے.. بہت بے آرام ہو کر کنویں کی تہہ میں سے نکلتے ہیں۔ اُبھرتے ہوئے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتے سطح تک آتے ہیں اور پھر اس سے پیشتر کہ کوئی انہیں دیکھ پائے وہ تھکے تھکے، آنکھوں میں دھول جھونکتے.. نظر نہ آتے.. نکلتے ہیں اور آس پاس کے کھیتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔

وہ صرف اس صورت میں نظر آتے تھے جن کو تو سب کنویں کی تہہ میں سے پھوٹنے والے پہلے پانیوں کو نکلتی تھی۔ کھیتے رہیں اور آنکھیں نہ جھکیں.. آنکھ کے جھپکنے کے پل میں وہ نمودار ہوتے ہیں اور اُسی پل اُچھلتے ہوئے کنویں سے اُتر کر تہہ میں آس پاس کی دنیا میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ہر کسی کی خاص طور پر بچوں کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ کھیتوں سے آنکھیں نہ جھکیں۔

جس دن ایک تھکے تھکے شخص نے یہاں پہنچا تو یہاں پہلے سے ایک شخص نے ناک میں

”بوئے“

ہر کوئی آس پاس دیکھنے لگا پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

”اوئے کہاں ہیں.. کہاں ہیں“

”میں نے دیکھے ہیں.. میں نے دیکھے ہیں.. وہ میرے قریب سے گذر کر کھاد کے کھیت میں گھس گئے۔“

کچھ لوگ اُٹھے اور گھنے کھاد کے اندر چلے گئے۔ اُس بچے کے بیان میں اتنا اعتماد تھا کہ اُس کی شہد پھر ایک بزرگ سے گئے۔ انہوں نے انہیں نظر تو نہیں آئے۔ پر وہ میری بخلوں میں سے گذر گئے ہیں اور مجھے کچھ گدگدی سی ہوتی ہے۔

اور تب نذر سے میراثی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کانوں کی لویں چھوتے ہوئے توبہ توبہ کی.. اللہ کو جان دینی ہے۔ ایک بوٹا پانی کی سطح پر تیرتا ڈوبنے کو تھا کہ میں نے اپنی شہادت کی اُٹھی آگے کر دی اور وہ اُچک کر اُس پر بیٹھ گیا، تھکے طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور یہ جاوہ جا.. بھاگ لگے رہیں اُس بوئے نے چوہدری محمد جہان نبردار ایسی پگڑی پہنی ہوئی تھی۔

اُور محمد جہان کھیت کی منڈیر پر بیٹھا گتا چھیلتا اُس کے گودے میں سے دس کو چوستا آ پو آپ مسکراتا جاتا تھا کہ اُس کے کنویں میں سے پانی نکل آئے تھے۔ لوگ بہشت نبی کو مبارکبیں دے رہے تھے اور اُس کی دونوں بیٹیاں اور اکلوتا بچہ کے گرد ہو کر اُس سے سوال جواب کرتے تھے کہ یہ بوئے کتنے بڑے تھے.. ہم سے بھی چھوٹے تھے اور انہیں

اپنے بچوں کو دیکھ کر محمد جہان کی مسکراہٹ سٹ گئی۔ اُس کے بچے میں جدائی کی برچھی ٹھس گئی۔ کاش آج ماہلو بھی زندہ ہوتی۔ یہ دن دیکھتی کہ اُس کے باپ کے کھدوائے ہوئے کنویں میں سے ایسے پانی بہہ نکلیں گے جو اس ویرانے کو پیر سیراب کریں گے کہ دنوں میں یہاں شیشم کے ایسے شجر سر بلند ہو جائیں گے کہ ہر شجر کی ٹہنیوں سے ایک جھولا بندھا ہوگا۔ وہ جس جھولے پر مرضی جھولے۔ اگر وہ زندہ ہوتی۔



UrduPhoto.com



بے سندھ پڑے۔ رات بھر کی مشقت کے بعد پنڈے کو آرام دیتے۔ بخت جہان کو محسوس ہوا کہ اُس کی چھاتی

بچے کے گھٹنے نہ تھے نیند بھرے۔ بچے کو کوشش نہ ہو سکی، وہ انہیں محسوس نہ کر سکتا تھا۔ محسن میں سویر کی دھوپ اُتری

لیکن بخت کی نیکی آنکھوں نے دھوپ کو تو بعد میں محسوس کیا پر اُس سے پیشتر اُسے اپنے گھٹنے پر سوار نیند کی

جس سے محسن میں کچھ عجیب سی مخلوق نظر آئی۔ جیسے چھوٹے چھوٹے گڈے ہوتے ہیں، نین نقش انسان والے پر قد رست میں

جس سے وہ الفیون کی دو تین گولیاں پالائی کے ساتھ نکل کر اوکھ میں چلا جاتا تھا تو اُسے بہت کچھ نظر آتا تھا، عجیب

جیسے خواب اور کھٹن جو ابھی واضح ہوتیں اور ابھی پکھل کر کسی اور شکل میں ڈھلنے لگتیں۔ پر ابھی تھکن کے حلق میں

جسے حقیقت کی اُس ٹھوک سے کچھ نہ گیا تھا جو اُس نے اس مخلوق کو دیکھ کر لپٹی تھی۔ یہ کلا۔ پھر ہر الفیون کا اثر تو نہیں ہو

تھا۔ اس مخلوق کی موجودگی کا سب سے زیادہ اثر وہ محسوس کرتا تھا جس کا اثر آتا تو بخت کو دیکھ کر وہ اپنی چار پائی سے

ٹھٹھکیں چاہتا تو اُنھیں نہ سکتا تھا۔ اُن میں سے ایک کے پورے برابر سر پر اُس کے بھائی محمد جہان ایسی چٹری بھی بندھی تھی۔

”کوئے کون ہو۔ کڑی یا ہو پو کون ہو۔“ اُس کی آواز گلے میں سے ڈر کے مارے نکلتی نہ تھی۔

تو اُس میں سے وہ بالشتیا جس نے پکڑی باندھ رکھی تھی اُس کا شملہ اونچا کر کے بولا۔ اور اُس کی آواز اُس کے

تحت سے نکلتی تھی۔ ہم تمہارے بھرا محمد جہان کے کنوئیں میں سے نکلنے والے بونے ہیں۔ اچھے پھلے زمین کے اندر آباد اور

حق پرست تھے اور پھر کرم داد اور مولا داد کی کھالوں نے ہمارے گھر ڈھا دیئے۔ ہم بے گھر ہو گئے، اب گھر کہاں کریں۔

تو بخت گھر میں بہت جگہ ہے تو ہم اسی میں آباد ہو جاتے ہیں۔

”کڑی یا ہو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لبوں سے نکل گیا۔

”ہمیں گالیاں نہ دو بخت جہان۔“ ایک نہایت درویش قسم کا بونا بولا۔ ”ورنہ۔“

بخت جہان لرز گیا۔

محسن کا قد آسمان کو چھوتا تھا۔ گلی میں سے گزرتا تھا تو گھر وندے مختصر ہو جاتے تھے، وہ لرز گیا۔ یہی قیاس کرنے



کی کوشش کرتا رہا کہ یہ سچ سچ کے نہیں.. وہم کی پیداوار ہیں.. بچھنے اور بلانے ہیں جو اگلے لمحے زائل ہو جائیں گی.. براہِ راست امرت کور کے خرائے صاف سنائی دے رہے تھے..

”نہیں یقین کرتے؟“ اُس ایک بونے نے اپنی مونچھوں کو تودایا اور اپنی برچھی کو بخت جہان کے سینے میں کھ دیا.. اگرچہ اُس برچھی کی نوک ایک سوئی کی نوک جتنی تھی، پر بخت جہان بلبلاتا تھا ”نہیں کرتے؟“ وہ در دے کراہ اٹھا کہ وہ خواب نہ تھے..

اُن میں کوئی بھور یا اور کوئی کالیا تھا.. ایک ڈب کھڑا تھا.. ایک مونچھوں والا اور ایک برچھی والا تھا.. اور وہ حسن اخلاق سے مالا مال تھے، تمیز دار تھے.. چنانچہ اُنہوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے الوداعی سلام پیش کیا اور ابھی یہاں تھے اور ابھی وہ وہاں نہیں تھے..

اُس کے سینے پر پڑا بوجھ زائل ہوا تو اُس نے ایک گہرا سانس لیا.. ایک فانی زدہ حالت میں پڑا رہا.. وہ تحلیل ہو چکے تھے اور اس کے باوجود وہ اُن کے اذیتناک پڑاؤں پر ہلکا ہوا تھا..

پیار کی پھیلنے والی کوٹریوں میں گوندا اور نوں بال ساری رات کراہنے کے بعد نہ بچتا تھا.. سونائی کے اُسٹر سے مختصر کر دیے گئے تھے اب وہ بھوس پڑے تھے.. اُن کے برابر میں جو کوٹھڑی تھی، وہاں بخت جہان کا اٹیون اور کھانسی کی شراب کے بعد سر سے من بعد ذخیرہ تھا.. ایک اعلیٰ ساخت کا ٹکٹے میں تیار کردہ ہاجہ باگرا مو فون تھا اور اُس کے پہلو میں ایک نواری پینک نہایت ترچھڑا ہوا تھا.. یہ گرامو فون ریکارڈ بھور سے رنگ کے کھردرے کا تھڈ کی پوشش میں ملفوف تھے.. اُن میں اُن زمانوں کی برصغیر کی سازن صحر آوازیں بھری ہوئی تھیں.. کھلا جھریا.. عنایت بانی ذخیرہ والی.. یہودی گانگ گہر جہان ٹکٹے والی.. مدن اور کندن لال سہیل کی آوازیں محفوظ تھیں..

بخت جہان جب دنیا بھانجنا شروع کیا تو اُس نے شراب کا بھی کچھ اثر نہ ہوتا تو وہ اپنے آپ کو مدھر کوٹھڑی میں الگ کر لیتا.. بونوں کی ڈبیا میں سے ایک نوئی احتیاط سے نکالتا.. اُسے گرامو فون کے بازو میں کس کر پسند کے ریکارڈ پر جب رکھتا جب وہ ایک خاص رفتار سے گھومتے لگتا..

دنیا پور تو کیا اُس پاس کے درختوں و یہاں میں بھی کسی ایک فرد کے پاس گرامو فون نہ تھا.. یہ نہیں کہہ سکتا تھا.. استطاعت نہ رکھتا تھا بلکہ نہ کوئی جس جمال رکھتا تھا اور نہ ہی کُن رس اور بخت جہان لاکھ برا ہونے کے باوجود حسیات کا امیر تھا..

یہ ایک بُرا خواب ہی تھا.. اُس نے اپنے آپ کو تسلی دی.. بھلا کبھی بونے بھی ہو سکتے ہیں.. اطمینان اور تسلی کی یہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیری لیکن اُسی لمحے گرامو فون کی کوٹھڑی میں سے ”بدریا برس گئی اُس پار“ کا دھیمہ اور مدھر گیت باہر صحن میں اُترتی سویری کی ڈھوپ میں آ گیا..

”کنیز فاطمہ..“ اُس نے اپنی خرائے بھرتی گھر والی کوٹھڑی پر وہ بیدار نہ ہوئی..

”اوئے امرت کورے..“ اُس نے اُس کا کندھا بلایا..

وہ فوٹو اٹھ بیٹھی۔ ”کیا ہے جہانیاں؟“

”بونے۔ میری کوٹھڑی میں گھس کر گراموفون بجا رہے ہیں۔ سن رہی ہوں؟“

”کون سے بونے۔“ امرت کور کے تن بدن میں وہ جان ابھی واپس نہ آئی تھی جو اُس نے پچھلی شب نکال لی

”وہی بونے جو میرا بجا بجا رہے ہیں۔ سن رہی ہو؟“ محمد جہان کے کنویں میں سے نکل کر یہاں آ گئے ہیں اور

کہتے ہیں کہ اب یہیں بسیرا کریں گے۔“

امرت کور کے بدن کی چولیس ہل چکی تھیں۔ وہ کسل مندی سے ایک کروٹ لے کر بولی۔ ”جہانیاں۔ کیلکری

شب بپائی کر تو تھک چکی گیا ہے۔ تیرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے، فیون کی زیادتی نے تجھے موقوف کر دیا ہے۔ کیا کبھی بونے بھی

ہوتے ہیں؟“

”کڑی یا ہوئی۔“ سکتھنے کی بجائے جہان اشکھال میں آ گیا۔ ”کوٹھا اکھنڈے وا ہے گرو کی سونہہ کہ تجھے کوٹھڑی کے

تھکے محسن میں اترتی ہے۔“ بدریا برس گئی اُس پار سنائی نہیں دے رہا۔ کھا سونہہ۔“

”جہانیاں۔“ وہ ایک فکر مند ماں کی مانند بولی ”تجھے پر اثر ہو گیا ہے۔ میں وا ہے گرو کی سونہہ کھاتی ہوں کہ۔ ہر سو

بے ہے کچھ کو سنائی دے۔“

اور جہان اشکھال میں آ گیا۔ ”پار سنائی نہیں دے۔“ اُس نے اُن میں گونجی

تھی۔

بس یہی۔ آہو یہی۔ جہان کو سارے جواب مل گئے۔ یہ بونے شونے سے کچھ اور تھا جو کبھی نہ کبھی تو ہونا

تھا۔ سب کا کانا اپنے قدموں پر مر جاتا ہے۔ چوتھے کا کانا اسی شرابی سے لے لیا کرتا۔ اپنی موت کو اپنے پلو میں باندھ کر بڑا

تھکاتا ہے اور جب وہ بھول بھال جاتا ہے کہ اُس کے پلو میں موت بندھی ہے تو یکدم وہ پلو کھول کر موت اُس کے

سے تھکڑی ہوتی ہے اور وہ ہلکایا جاتا ہے، پانی سے ڈرنے لگتا ہے۔ جیسے وہ اُسے ڈس لے گا۔ اور بھوکا پیاسا بھونک

بھونک کر مر جاتا ہے۔

بس یہی۔ یہی تو جیہہ تھی۔

جانوں کے اس محلہ مغربی کی میز میز میزوں اور گندی تالیوں کی بھول بھلیاں سب کی سب ایک چوک میں

باندھتے تھے۔ یہ ایسا چوک نہ تھا جو شہروں ایسا تھا۔ اگر کسی شہریے سے یہ کہا جاتا کہ یہ چوک ہے تو وہ پوچھتا کہ۔ کہاں ہے؟

اور سے لوہاروں کی گلی آ رہی ہے۔ جو ہڑکی جانب سے کہہ روں کی گلی اترتی ہے اور وہاں سے جانوں کا محلہ شروع ہو رہا

ہے۔ سب کے مقام کو جہاں بمشکل پانچ چھ موٹی بندھ سکتے تھے، گاؤں والے چوک کہتے ہیں۔

اسی چوک میں مائی ہلکی کا بسیرا تھا۔

وہ حافظہ جی کے گھر کی کچی میز جیوں تلے ایک کھوہ میں رہتی تھی۔ اگر چہ ایک عام غٹے کی عمر دس بارہ برس سے

تجوار نہیں کرتی پر مانی بگلی کی عمر کا کچھ حساب نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک نوخیز ستوری تھی تو ایک سنگ پتھر قسم کا زہرہ سانپ کھا جانے سے ہلاکی گئی تھی۔ باؤلی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ دوزہر گویا اس کے لیے آب حیات بھی ثابت ہوا تھا۔ بھی تک زندہ تھی۔

سرگی سویرے یا رات گئے اُدھر سے جو بھی گزرتا، ذرا احتیاط سے کھانستا ہوا گزرتا کہ کہیں مائی ہلکے اُس پر چپکے سے حملہ آور نہ ہو جائے... بخت جہان جب ایک رات بچا جو جاٹ کے مالٹوں کے باغ میں اپنے کچھ جگری بلیوں کے ہمراہ پنی پلا کر گھر لوٹ رہا تھا تو اُس چوک میں سے گزرتے ہوئے اُسے مائی ہلکی کی ہلکی سی غراہٹ سنائی دی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اُس کے قریب نہیں آئی تھی مگر اب جو اُسے بونے شوٹے دکھائی دے رہے تھے اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مائی ہلکی نے اُس شب حالتِ خمار میں اُسے کاٹ لیا تھا اور اب جا کر اُس کے زہریلے دانتوں کے اثر سے وہ ہلکا یا گیا تھا اور اسی لیے وہ جو نہیں تھے اُسے نظر آتے تھے۔

وہ اس توجہ کو دریافت کرنے کی حد تک سہاوت ہوا کہ نئے سے نئے پانچل ہو کر بیویک بھوک کر مرنا کہتے  
 زیادہ خوشگوار ہے بجائے اس کے کہ ایک انسان کی چھاتی پر عمر بھر یونے ٹو دتے رہیں اور وہیں کے گراموفون پر قابض ہو کر  
 ”بدر باہرس“ اس بار بجاتے رہیں۔

پورا اسی لمحے بخت جہان کے کانوں میں جیسے اُس کا مستحکم اڑانے کی خاطر اُس کی اس حرکت پر قہقہہ لگا کر ہنسنے کی خاطر کہہ دیا۔ "اے افسانہ نویس! کیا تو نے اس شخص کی آمد سے پہلے اور صرف آواز میں "بدلی برس گئی اُس غار" کا گیت سنائی دینے لگا۔ جیسے وہ اعلان کر رہے ہوں کہ ہم کوئی شک شبہ یا دھمکہ نہیں ہے۔ خیال کی شعبہ باز آئی نہیں ہے۔ ہم ہیں۔"

کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ اپنی دروازے کا مٹی کو ذرا جھکا کر اندر داخل ہوا۔ اس نے اندھیرے میں "بدر یا بدس" کی آواز سنی۔ اس کے بعد اب "برسورے" کا آواز سنا۔ وہ روتے رہا۔

گراموفون کی ٹوٹی پلاسٹک کے سیاہ ریکارڈ کی لکیروں پر گھومتی اپنے سفر کے اختتام تک پہنچ کر ہڑبامشرواؤں کے کتے کی تھوحتھنی کے قریب ہو کر انک گئی تھی اور برسورے... برسورے... برسورے کی گردان جاری تھی۔

ایک بونے نے آگے بڑھ کر گراموفون کا ہیڈ اٹھا کر.. پر سورے کا ریکارڈ اٹھا کر اُس پر ایک اور ریکارڈ جما دیا..  
 "اے خاندانِ حبیبِ شہ جان.. جب تک میں گیت گاؤں.."

کاشن بالہ کی مدد اور جنسی آواز کو فحش مزے کے اندھیروں میں سٹپلے لگی.. جنت جہان کے جی میں تو یہی آئی کہ وہ ان کڑی یا ہوئے یونوں کو اپنی ڈانگ سے ڈھٹک کر رکھ دے.. پر اس میں کچھ سکت ہوتی تو وہ ایسا کرتا.. وہ بونے اُسے قاتل زندہ کر دیتے تھے..

تو وہ ہلکایا ہوا نہ تھا۔۔۔ یہ تو جہرہ و جہیوں میں بکھر گئی تھی۔۔۔ بونے تھے۔۔۔ اور ستم یہ کہ موسیقی کے رسیا تھے۔۔۔ اور انہوں نے اُس کی جانب کچھ دھیان نہ کیا۔۔۔ اُس کی موجودگی سے لائق اپنے آپ میں اور موسیقی میں مگن





لکھائی براہمنوں یا مولویوں کے کھیتے تھے۔ جاٹوں کے بچوں کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ دو چار برس میں اگر پڑھ سیکرے دو چار سیپارے پڑھ لیں۔

آخر محمد جہان سے ایک دس برس کے بچے سے لوگ کیوں خوف کھاتے تھے۔ یہ ابھی پچھلے برس کا قصہ تھا جب گندم کی کٹائی زوروں پر تھی، زمیندار ایک ہراس میں مبتلا تھے کہ آسمان ابر آلود ہونے لگا تھا، بادلوں کے پرے کے پرے اڑتے پھرتے تھے اور وہ کسی بھی لمحے برس سکتے تھے، گندم کے خوشوں میں خفتہ دانوں کو سیاہ کر سکتے تھے، پودوں کو گیلا کر کے انہیں زمین پر بچھا کرنا کارہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ زمینداروں نے اپنے کھیتوں میں جتنے بھی کامے اور دین دار لگا رکھے تھے وہ ان کے سروں پر سوار رہے۔ ان کے شانہ بہ شانہ درانٹیاں چلاتے ان سے آگے نکلتے جاتے، نہ خود دم لیتے نہ انہیں دم لینے دیتے مسلسل انہیں غیرت دلاتے ابھارتے، آسمان کی جانب دیکھتے۔ اوئے افیم کھا کر آئے ہو بھٹے مانسو۔ بے شرم ہاتھ چلاؤ۔ ان ہاتھوں میں پتھر پڑیاں پہن رکھی ہیں جو ٹوٹ جائیں گی بے غیر تو۔ یکدم بارش کا خوف انہیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔ گندم کے ان دانوں پر ان کی گل جھلک رہی تھی، ان کے سر پر آلودہ دانوں کا بھاری بھوتا تھا۔ وہ اگر مولوی صاحب کی جھولی میں ہر شام کھجور کی روٹی نہ ڈالیں گے تو وہ اذان کیسے دیں گے۔ سچ جہان کے ہاتھ بھی شل ہونے لگے۔ درانٹی کی ہتھی کی کھوئی اور اس پر جمی ہوئی انگلیاں یوں پیہم ہو چکی تھیں کہ وہ اس سے جدا نہ ہو سکی تھیں۔ اس نے ذرا دم لیا اور اس پاس نظر کی تو اس کی نظر میں اس کا بیٹا محمد جہان نہ آیا۔ جوا بھی تو اس کے برابر میں درانٹی چلا رہا تھا اور ابھی وہاں نہ تھا۔ فتح جہان کی کھجوریں کھانے لگی تھیں۔ ہاں کہہ جاتے۔ کھجوریں کھانے لگی تھیں۔ ہاں کہہ جاتے۔ ہاں تک اس کے رقبے میں گندم کے دانوں سے حاملہ سنہری بالیاں ایک زرد دریا کی مانند کروہیں بدلتی تھیں جیسے وہ جسم کو بے چین ہو جھل ہوں۔ اور اس کے درمیان میں اسے محمد جہان ایک شانت مہا تماہدہ کی مانند آلتی پالتی مار رہا تھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں درانٹی نہ تھی۔ سچ جہان نے پہلے تو یہی قیاس کیا کہ شاید وہ کسی حاجت کی خاطر وہاں بیٹھا ہے لیکن جب وہ دیر تک وہیں براہمن رہا تو وہ اپنے گندم کے کھیتوں کی طرف دیکھ کر ہلکا ہلکا ہنسنے لگا۔ اس نے وہ منظر اپنی آنکھوں کے سامنے پایا جس کی شہرت ایسی ہوئی کہ گاؤں کے لوگ اس سے ڈرنے لگے۔

محمد جہان سنہری بالیوں کے درمیان ایک ڈھونڈی رماے فقیر کی مانند آلتی پالتی مارے براہمن تھا اور آنکھیں بند کیے ان بالیوں سے باتیں کرتا تھا۔ اور ان بالیوں کے دانوں سے لبریز ہونٹ کھلتے اور ان میں سے گندم کے پکے ہوئے دانے خود بخود سوکھی زمین پر گر جاتے، ڈھیر ہوتے جاتے۔ بونے جوں کے ٹوں کھڑے تھے پر ان میں پوشیدہ دانے گرتے جاتے تھے۔ جیسے اس کا کہا مان رہے ہوں۔ ٹل بھر میں فتح جہان کے رقبے میں گندم کے دانوں کے ڈھیر لگ گئے۔ کٹائی مکمل ہو گئی۔ وہ بینہ بارش کے ہراس سے آزاد ہو گیا۔ اب یہ جتنا برس چاہیں برس لیں۔

ایک روز دھریک کے درخت تلے، اور یہ وہ دن تھے جب دھریک کے پھولوں کے جامنی گلچے گاؤں کے جوانوں کے بدنوں میں اپنی مست مہک بھر کر انہیں خمار آلود کرتے تھے اور انہیں باگیں تڑوانے پر مجبور کرتے تھے تو فتح جہان کی گھر والی زہرا بی بی نے دیکھا کہ دھریک تلے بیٹھے اس کے بیٹے محمد جہان کے بازو پر ایک زہریلا نچوڑ لگ گیا ہے اور وہ نہ اسے جھٹکتا ہے اور نہ ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنی گردن میڑھی کیے نہایت اطمینان سے اسے کچھ کہہ

جنت جہان سے پاتھیں کر رہا ہے... وہ اپنے بیٹے کی جان خطرے میں جان کر دوڑتی ہوئی ایک فطرتی عمل کے تابع اُس کے پاس جاتے تھے جب اُس نے دیکھا کہ محمد جہان نے اُسے ذرا بلند آواز میں کہا "چلا جا" اور وہ نکھو اُس کا تابع ہوا اور اُس کے قدم سے اتر کر دھریک کے تنے کے اندر کہیں رو پوش ہو گیا۔

جب وہ گاؤں پر براہِ جان ہو کر کنویں کو گیزر نے والے بیلوں کو پیار سے ہو جو کر کر کے ہانکتا تو تہہ میں سے برآمد ہوتے ہیں تمام کی تمام ٹڈیں پانیوں سے چھلکتی اور اندھی ہو کر اولوں میں ایک سیلاب لے آتیں۔ یہاں تک کہ اولو لبریز ہو جاتا تھا پانی اُس میں سے جھرنوں کی طرح بہہ نکلتے اور نزدیک ترین کھیتوں کو بھی سیراب کرنے لگتے۔ کم از کم ایک بار ایسا ہوا کہ محمد جہان کی موجودگی سے کنویں کے پانی تہہ میں سے بلند ہوتے کناروں تک آئے اور پھر اُبل کر ہر گھل بولے، ہر فصل اور پھل پھل کو پانی پانی کر دیا۔

فتح جہان نمبردار کے ہاں محمد جہان کے بعد الف جہان پیدا ہوا اور پھر بخت جہان۔ اور ان کے درمیان پیشیاں

الف جہان اکبر جہان کے بدن کا ایک ناتواں بچہ تھا جو دس برس تک ٹھنک رہا، بولا نہیں، اور جب بولا تو اتنا کم بولا کہ کوئی سمجھا ہی نہیں بولنے کی عادت ہی نہ پڑی۔ زندگی کے معمولات میں وہ اشاروں کنایوں سے ہی کام چلاتا رہا۔ وہ تہہ میں جہان کے بل میں جوتے ہوئے تیل اتنے ست پڑ جاتے کہ وہ بقیہ بل چلانے والوں سے بھی گزر جاتا تب وہ اُٹھ کر پھر کے بل میں جوتا بولتا تھا۔ اُس کی بیوی اور پھر اولوں کی وجہ سے اُس کی دوسری شادی ہو گئی اور اُس نے باوجود وہ بے اولاد رہا۔ آخر جب وہ صرف تیس برس کی عمر میں سانپ کے کاٹے سے مر گیا تو اُس نے جوتے بولے کہا۔ میں تیرا آیا تھا اور تیرا چار ہا ہوں۔

اور فتح جہان نے اُٹھ کر بیٹے بخت جہان کے ناک نقشے اور نیلی آنکھوں کے تھوڑے چھل جہان میں تھے۔ وہ اپنی ٹھٹھم بی بی جس نے اُسے دس برس کی بی بی کی کہہ دیا تھا، وہ تہہ میں اُس کی ٹھٹھم ناک اور آنکھوں کی طرح سر ہل کرتی رہی۔ وہ اپنی ماں کی موت بھی ثابت ہوا۔ ڈہراں اُس کی پیدائش کے عمل میں اتنی کٹ پھٹ گئی، اور چھٹی کے بعد تھوڑے روز اُس کا جنازہ اُٹھ گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بخت جہان کی خصلت میں جو طیش آیا، ظلم اور بے حسی کی جو آتش لگائی اُس کا سبب یہ تھا کہ اُس نے اپنی ماں کے دودھ کی بجائے شادو تیلن کی دیہیز چھاتیوں میں منہ مارا تھا جسے چوہداری فتح جہان نے اپنے نونو کو دینے کے لیے پرورش کی خاطر ملازمہ رکھ لیا تھا۔ شادو تیلن کی خصلت بھی بس یہی کچھ تھی۔ ورنہ محمد جہان بھی اُن کی پاپ کا بیٹا تھا۔

الف جہان بے اولاد قبر میں اترا۔ محمد جہان کے ہاں پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان میں سے سب سے

بڑی بیٹی جہان کی سوکن نے زہر دے دیا۔ اور بخت جہان۔ اُس کی آل اولاد کی گنتی کیسے کی جاسکتی تھی۔ نکاح کے اندر یا باہر کا کوئی خاص حساب نہ تھا۔ تو یہ ساری کارستانی محمد جہان کی تھی۔ اگرچہ اب تو کبھی شادی بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ شخص دس برس کی عمر میں گندم کے



اور وہ نہ صرف اُن سے بلکہ پرندوں سے بھی باتیں کر سکتا تھا کہ اب تو وہ ایک دھیسے مزاج کا صوفی منش شخص تھا اور ایسے کرشمے دس برس کی عمر کے بعد کبھی ظہور پذیر نہ ہوئے۔ پر کیا پتا۔ اگر وہ ایک زمانے میں ایسے تجزوں پر قادر تھا تو اب اُن یونوں کو اُس کے گھر روانہ کرنے کا سبب بھی ہو سکتا تھا۔

محمد جہان ابھی اپنے نومولود کنویں سے واپس نہیں آیا تھا۔ اُس نے وہیں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ سر شام قبرستان کا رخ کرتا اور اپنی بیٹی مابلو کی قبر پر جا کر اُس سے لپٹ کر رونے لگتا۔ واپسی پر اپنے چہرے پر سے وہ مٹی نہ پونچھتا جو مابلو کی قبر کی ہوتی۔

بخت جہان ڈانگ کھڑکا تاویزے میں داخل ہوا تو بہشت بی بی اُپلوں میں پھونکیں مار رہی تھی اُس کی دونوں بیٹیاں اور بیٹا جو اُس کے گھٹنوں سے لگے بیٹھے تھے اپنے اس زہرناک چاچے کو دیکھ کر خوفزدہ حالت میں فوراً پچھلی کوٹھڑیوں میں روپوش ہو گئے۔

”بھرجائی۔ محمد جہان کدھر ہے؟“

بہشت بی بی نے اُپلوں پر ایک آخری پھونک ماری اور آنکھیں جن میں دھواں سما چکا تھا، اٹھا کر بیڑاری سے بولی ”آج بھرا کو کیسے یاد کر لیا؟“

بہشت بی بی نے جہان کو اندھا کر دیا تھا۔ اُس نے میرے گھر بولنے بچنے دیکھے ہیں جو میرے سینے پر ناپتے ہیں، میری ریکارڈوں والی کوٹھڑی پر قابض ہو کر میرا گرا فون بجاتے ہیں۔ بڑے بھائی آئیے بڑے ہیں بھرجائی؟“

”بونے؟“

”آہو۔ اور اُن میں سے ایک ایک کو بھرتا ہوں۔ بھرتا بھرتا ہے۔“

”جہانیاں۔ تو کسی نہ کسی نقشے میں ہے۔“

”نہ بہشت بی بی۔ تو مجھ سے قسم لے لے۔ میں نے ابھی افیون کی ایک گولی بھی نہیں لگی، شراب تو دور کی بات ہے۔ تو یہ بتا کہ محمد جہان کو کیا حاصل حصول تھا کہ اُس نے میرے جہاں سے نکڑوں پر سوں سے نیو لے۔ سانپ اور بچھوڑے ہیں اور جہاں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگ سکتا تو وہاں اپنی گل پونجی پھونک کر بے وجہ ایک کنواں گھدوانے لگے۔ اُن نے یہ کنواں صرف اس لیے گھد دیا ہے کہ اُس میں سے بونے برآمد ہوں جو مجھے ڈرائیں، مجھ پر راج کریں۔ وہ ہے کہاں؟“

”جہانیاں۔“ وہ اُٹے سلاگاتی اٹھ کھڑی ہوئی اور بخت جہان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

وہ ایک مختصر قامت کی نہایت گوری چٹنی اور تیکھے ناک نقشے والی دہنگ عورت تھی اور جب وہ یکدم بخت جہان سے ماتھا لگا کر کھڑی ہو گئی تو وہ ٹھٹھک کر ذرا پیچھے ہو گیا کہ بہشت بی بی کی ذات میں ایک مردانہ بے خونی اور دلیری بھی تھی یہ فیصلت اُس میں دھیرے دھیرے سرایت ہوئی۔ محمد جہان اتنا دھیمہ اور حلیم الطبع شخص تھا کہ وہ ہر کسی کی خطا بخش دیتا تھا۔

تھی۔ جنت جہان میں نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کسان اُس کے رقبے کے برابر میں آبپاشی کی ایک نالی کھودتے ہوئے  
 اُس کے رقبے پر کندال چلا دیتا تھا جس کے نتیجے میں اُس کی ملکیت کے دو چار مرلے اُس کے حصے میں چلے جاتے تھے تو  
 ایسے سو سو برس تو قتل ہو جاتے تھے پر وہ احتجاج بھی شدت سے نہ کرتا صرف درخواست کرتا کہ بھائی ایسا نہ کرو۔ اسی لیے  
 ایک سے حصے دیتے تھے کہ اُسے ایک عورت ہونا چاہیے تھا۔ یوں کاشتکاری کے شب و روز کو ایک کنویں کی مانند گیزر  
 اُس میں سے گھریا اور بال بچوں کے لیے جو روٹی پانی نکالنا ہوتا ہے۔ جو تک و دو درکار ہوتی ہے۔ جو محمد جہان میں نہیں تھی،  
 جنت جہان میرے دھیرے بہشت بی بی کی شخصیت میں سے مجبوراً پھوٹنے لگی۔

”دیکھ جہانیاں۔ تیرے عادت اطوار نہیں بدلنے والے۔ ڈانگ سونا کرنا۔ پرانی زنائوں کو دیکھ کر کھٹکے رہے  
 جنت جہان نے گور گھوڑے رکھنے۔ اور تجھے بگاڑا کس نے ہے، محمد جہان کے لاف پیار نے۔ تو نے آج تک ایک تنکا بھی دوہرا  
 کیا ہے۔ وہ تیرے حصے کی زمین پر جانوروں کی طرح مشقت کرتا ہر برس تیرے بھڑولے بھرتا ہے۔ الف جہان مرحوم کا  
 گھر سارے کا سارا تجھے دے دیتا ہے اور اُس کے باوجود تو اُس کے گھر سے بڑھ کر کھڑا تالا کارے مارتا آ جاتا ہے کہ  
 گھر جہان کہاں ہے۔ بے غیرتا۔“

جنت جہان کے پنڈے پر بہشت بی بی کا ہر فقرہ ایک دڑے کی مانند برستا اور وہ اُس کی شخصیت سے یوں دھکیلا  
 جنت جہان کے ساتھ جاگا اور پھر منہ بسورتا ہوا سہا ہوا معصومیت سے بولا۔ ”بھرجاتی۔“

”مرگئی۔“ گرجتی۔ ”جہانیاں۔ جہانیاں۔ جہانیاں۔“ جہان نے اپنی گندم کا  
 اُس کے اُلوں پر کڑکڑاتے ہوئے اس لیے کھدوایا ہے کہ اب ہماری پوری نہیں پڑتی۔ قانون کی نوبت آ رہی ہے۔ ہم بھرجاؤں  
 کے حصے والے کو بھی اپنی زمینیں سیراب کرتے تھے تو اُس پانی کے بدلے میں انہیں اپنی آدمی فصلیں لڑینی پڑتی تھی۔  
 میں جنت جہان بھی ہے تو خوب جانتا ہے۔ اور جیسے محمد جہان اُس کی منی کے ہر ڈالے کو اپنے خلیں پیپے سے سینچتا ہے، یہ بھی تو  
 جانتا ہے۔ تیرا کیا قیاس ہے کہ اُس کے اُلوں پر کھدوایا ہے کہ اُس کے اُلوں سے بونے شونے نکل کر تیرے گھر  
 گھسے جائیں۔ ہیں؟ ہمارے بھڑولوں اور چائیوں میں شکر، نم یا گندم کا ایک دانہ بھی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ میری جو دو  
 کھجوریں جس دو بھی فروخت ہو گئیں اُس کنویں کو کھدوانے کی خاطر۔ صرف اس لیے جہانیاں کہ اُس میں سے بونے نکل  
 جنت جہان جہان میرے گھن سے اور جا میری طرف سے انیوں کی ماشے بھری گولی کی بجائے دو ماشے کی گولی حلق میں اتار۔  
 جنت جہان کے ساتھ لیٹ جا۔ جا۔“

اُس کے سر پر گسی ہوئی پُرد چاہت پڑی تھکنے لگی اور اُس نے اُسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سنبھالا دیا اور  
 جنت جہان کے قدموں میں تھی اُسے محسوس کر کے پچھلے پاؤں پیچھے ہوتا اپنے بڑے بھائی کے گھر سے نکل کر گلی میں  
 جنت جہان جہان ہے کی سات بطخیں گندی نالی کے سیاہ بکچڑ میں چونچیں ڈبوئے اُسے حلق میں اتار اُس میں سے کیزے  
 کھانے چھانے کی کوشش میں جنت جہان کو دیکھ کر چونکی ہو گئیں اور پُرد پھڑپھڑاتی قیں قیں کرتی چونچیں نیچی کیے جیسے اُس پر  
 جنت جہان کے گھونے کو ہوں، اُس کے قریب ہونے لگیں۔

”گولی یا ہویاں۔“ وہ پھٹ پڑا۔ بہشت بی بی کے ہاتھوں بے عزت ہو کر۔ اُس کے اندر طیش کا جولا وا تھا وہ

”خس و خاشاک زمانے“

اُن بطنوں پر پھٹ پڑا اور وہ اپنی ڈانگ سونت کر اُن پر پل پڑا۔ بطنوں کو اس پر تشدد و عمل کی توقع نہ تھی۔ پہلے تو وہ شش گئیں اور پھر شور مچاتیں قیس قیس کرتیں۔ حاملہ عورتوں کی مانند چلتیں شیخوں کے محلے کی جانب چلی گئیں۔ اُن میں سے ایک جو بخت جہان کی ڈانگ کی زد میں آ گئی تھی۔ لنگڑاتی ہوئی اُن سب کے پیچھے پکارتی چلی رہی تھی۔

ویسے تو وہ ادھر دیکھنے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔

ادھر جہاں شیخوں کے محلے کے آغاز میں گند بلا کی ایک ڈھیری تھی۔ لیکن اُس کی نظریں اُس لنگڑاتی ہوئی بخت تعاقب میں بے اختیار چلی گئیں اور پھر وہیں جا ٹھہریں جسے دیکھنے سے وہ ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ اچھو شیخ اپنا گلا کاٹ رہا تھا۔

دھوپ کی بڑھتی ہوئی جھلک میں باوجود شیخ کا کھونا بیٹا بھی اس کی منہ نہیں بھیجی تھیں کوڑے کی ڈھیری اطمینان سے براہِ جان۔ ایک تیز دھار نوکیلے شیشے کے کٹڑے کو اپنی نیزہ سی کی ہوئی گردن چھو کر اپنے ماس کو بری طرح رہا تھا اور جو خاشاک اُڑا گہری ہو گئی تھی اُس میں سے خون رس رہا تھا۔ اچھو کے قہار سے ہوئے تھے غصہ کی غصہ کی رنگی جاری تھی اور خون کے چند قطرے اُس سے پھسل کر بازو پر ہوئے ہوئے سرکے گہنی تک آنے کو تھے۔ اور وہ ایک عجیب کیفیت جذب کے تحت اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلتی تو گنڈی چڑھا کر لٹکتی تاکہ وہ فرار نہ ہو جائے۔ اُس کی آنکھیں گہنی کے کھلے میں چلتے زمین پر پھیلتی رہیں۔ کوئی چھوٹا سا شیشے کا فلتر آ جاتا تو اُسے اٹھا کر پلو میں باندھ لیتی کہ وہیں یہ میرے اچھو کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اور پھر اُسے ایک متروک شدہ گھوٹ میں پھینک دیتی اور وہیں کھوس والے کا ٹھکانہ پھینکتے تھے۔

اُن زمانوں میں شیشے کی ایسی بہتات نہ تھی۔ چینی کے برتن بھی کم کم ہوا کرتے تھے، کچے مٹی کے برتنوں میں کھانے پینے کا رواج تھا، محلہ مغربی کے جانوں کے ہاں بھی کچے پیالوں، رکابیوں، ہانڈیوں اور گلابیوں کے سوا کچا نام نہ نہ ہوتی تھی۔ لالٹیں بھی شاذ ہی کسی گھر میں ہوتی تھی اور وہ بھی خوشی یا غمی کے موقعوں پر روشن کی جاتی تھی۔ دیے جلتے تھے جو کچے ہوتے تھے۔

البتہ شیخ اللہ دتہ کی شرتوں کی بنی اور مسجد والے حافظ جی کی نیاری کی دوکان میں چند بوتلیں ہوا کرتی تھیں پر بھی کم ہی ٹوٹی تھیں۔

اس کے باوجود اچھو شیخ جب کبھی اپنی کوٹھڑی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اُسے اپنے حصے کا شیشہ پاؤں میں پڑا مل جاتا۔ کہیں اور نہ جاتا ہمیشہ اُسی ڈھیری پر جا بیٹھتا اور اپنا گلا کاٹنے میں مشغول ہو جاتا۔ بخت جہان جس کے آگے ایک چڑیا بھی دم نہ مار سکتی تھی، اُس کی ڈانگ کی زد میں آ جاتی تھی وہ اگر کسی سے قہار تھا تو بہشت بی بی سے، بونوں سے اور اچھو شیخ سے۔ اللہ سے ڈرنے کا خیال اُسے کبھی آیا ہی نہ تھا۔





چناب کے گلدے لے خضدے بہیت پانیوں پر جن میں سوہنی کے گھرے کی گلاوٹ تھی، اُس سرگی سویر میں  
ایسی ہلکی و خند ٹھہری ہوئی تھی جس کے پار دیکھا بھی جاسکتا تھا اور نہیں بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

[illegible]

چناب کے دوسرے کنارے پر چنگی سیلے میں کچن پانچواں دروازہ کمرست بہت دنوں سے ڈیرا ڈالے ہوئے ہے اور اُس کی بھینسوں کو وہاں اتنا گھاس میسر ہے کہ اُن کے تھن ذودھ سے بوجھل ہو کر زمین سے ٹھنٹے ہیں اور اُس ڈنگروں کے لیے اتنا چارا چرنے کے لیے ہے کہ وہ خود دھرتی ہوتے جاتے ہیں کہ انہیں کھونٹے سے باندھنے کے دوسرے ذریعہ داروں کی مدد ملتی پڑتی ہے۔ وہ امیر بخش اپنے باپ کے لیے صبح کا ناشتہ لے کر جا رہا ہے اور حسب عادت میں اترنے سے جیستر اُس دھندلی سویر کے سحر میں گرفتار دم بخود کنارے پر بیٹھا ہے۔ تو وہ کوئی بچہ سب کچھ جانتی تھی اس وہ نہ ٹھنکتی نہ خوف کھاتی تھی البتہ میں اُس کے سر کے اوپر پہنچی کر اپنے لائبے پروں کو زور زور سے جھٹک کر پھر پھرتی تو جمع شدہ دُھند کے سفید ذرے امیر بخش کے چہرے مہرے پر ایک نیم سلف کی صورت گرتے اور اُس کی سرخ و سپید گھا پر مزید سپیدی بچھا دیتے۔ البتہ دُھند کے یہ سفید ذرے اُس کی آنکھوں میں سرایت نہ کر سکتے کہ اُن کی نیلا ہٹ کے مارے وہ پگھل جاتے۔ جب بہت زمانے گزر گئے اور اُس کی آنکھوں کی نیلا ہٹ مدھم پڑنے لگی تو بھی اُن میں وہ حدت قائم رہی جو حیات کے دُھند لگوں کو پگھلا کر اُن کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

گلدے مخ پانی ٹھہرے ہوئے لگتے تھے صرف اُن پر ہلکورے لیتے ہوئے چند جھکے اُن کے بہاؤ کی دلیل تھے۔

جنت ان پانیوں کے اوپر گویا دُھند کا ایک جوہر یا تھا، دریا کے اوپر ایک اور دریا تھا وہ تھا ہوا تھا۔ پر زندہ تھا۔ اُس کے حلقوں کی سفیدی کو اپنے پروں سے رنگتے رنگیں پکھیر تھے جو ابھی اُس میں گم تھے۔ چڑیاں تھیں جو چبکتی تھیں۔ پر ان کے منہ کی دھندلکی و صبر ج سے روشن ہوتی جاتی تھی وہ پکھیر پوشیدگی میں سے ظاہر ہونے لگتے۔ پھر پھڑپھڑاتے چبکتے ایک دھندلے کے ساتھ لاڈ کرتے دکھائی دینے لگتے۔ اپنی اپنی بولیاں بولتے دکھائی دینے لگتے۔ سورج کی پہلی کرنوں کی حدت سے ان کے چہرے گنتی وہاں وہ پکھیر بھی تحلیل ہو جاتے۔ صرف ایک دیوانہ سا مٹی بھر پرندہ دُھند کے اُس چھتے دریا میں تکیہ بنا کر تحلیل نہ ہوتا۔ وہ اُس میں سے اُس کیسر تھائی سے خوفزدہ دُھند کے چھتے دریا میں سے ایک تڑپتی ہوئی مچھلی نکلتا تھا۔ کربا ہر آتا اور امیر بخش کے بالوں کو اپنے پروں سے لچھوتا گوشت ستارہ کے قدیم قبرستان کے ٹیکروں کے جھنڈے میں پیش ہو جاتا۔ ان ٹیکروں کے کانٹوں کے گرد بھی دھند نے سفید جالے بن رکھے ہوتے جو اُس مٹی بھر پرندے کی آمد سے بچ رہے ہوتے۔ امیر بخش جان جاتا کہ اب اُسے دریا میں اترنا ہے اور پار جانا ہے۔

اُس کے چاہے حکم دین کا کہ تھا کہ پھر مگر کی کوئی سے چاہے کے پانیوں کے اوپر جو دُھند مدھ قدم سے ٹھہرتی تھی اُس کے اندر کوئی پکھیر نہیں ہوتا۔ چڑیاں نہیں چبکتیں اور کوئیں تو ہمیشہ بلند یوں پر اُڑتی ہیں وہ بھلا نیچے اتر کر کیسے اُٹھتی ہیں تو یہ سب تیرے گمان ہیں۔ وہم اور قیاس ہیں۔ دیکھو اگر یہ ہوتے، پرندے، چڑیاں اور مچھلیاں۔ اُس کے جسم و دین کو نظر نہ آتے جسے اپنے کھیتوں اور پادوں میں رنگنے والے کیڑے مکوڑے سانس اور نیلے اور جنگل کے پتے بھی نظر نہ آتے۔ تو وہ حیاں بہت کرتا ہے۔ دماغ بہت لڑا ہوا ہے اور فور ہو جاتا ہے۔ وہم کے پرندے ہیں۔ پر چاہے کوئی نہ ہو۔ گت سیاہ دُھند مکوڑے بھی نظر نہ آئے تھے جو اسے نظر آئے تھے، بہت دن تو نہ گزرے تھے جب اس کا داوا دیا گیا تھا۔ جب اس کا چہرہ روئے چلا جا رہا تھا اور وہ اُس کی انگلی تھا سے چٹان کے نیچے چھپے چلا جا رہا تھا۔ اُسے کو لہ میں اتار کر جب برادری کے لوگ وہاں پہنچے تو وہاں سے اُسے دُھند میں گم کر رہے تھے تو اُس مٹی کے ہر دھندلے کے ساتھ ایک موٹا مکوڑا نمودار ہوتا دکھائی دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب قبر کا اُبھار اُبھرا تو اسے مٹی کا ایک ذرہ بھی نہ دیکھا۔ یہاں تک تھا جیسے داوے کی قبر پر سیاہ سونے مکوڑوں کی ایک رنگتی ہوئی چادر چھپی ہے۔ جب بھی چاہے نے کہا تھا کہ یہاں تک مکوڑا ابھی نہیں ہے امیر بخش۔ یہ سب تمہارے دھیان کا فتور ہے۔

اُس جنگل نیلے میں اپنے دُھند و گھر سمیت محکم دین تھا کا شکار نہ تھا، بہت سے دوسرے۔ کچھ اپنے کچھ پرانے گھر کے نیچے ڈالے ہوئے تھے اور اُن کی گھر والیاں بھی گاؤں سے وہاں منتقل ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے توے اور پراتیں لے کر اُن کے قریب آ کر اُس جنگل میں چولہے سلگا کر اُن کے روٹی پانی کا بندوبست کرتی تھیں۔ صرف محکم دین کی گھر والی رابعہ بی بی اپنے گھر سے باہر نہ آتی تھی۔

نیم وحشی اجداد عورتوں سے مختلف تھی۔ ان کی مانند جانگلی اور بے پردہ نہیں ہو سکتی تھی کہ اُس کا خاندانی پس منظر گنوار اور ان پڑھ نہ تھا۔ وہ خود تو پڑھی لکھی تھی۔ اس کا ایک بھائی علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے ایل ایل بی کر کے شیخوپورے میں وکالت کرتا تھا اور دوسرا بھائی



”خس و خاشاک زمانے“

سکول انسپکٹر تھا۔ اُس کے گئے چاہے کا بیٹا سمندری جہازوں میں نوکری کرتا تھا۔  
وہ اُن جیسی نہ تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنے ایسے تعلیم یافتہ خاندانی پس منظر کے ساتھ آخر کو ستارہ ایسے چٹے اُن چہرے  
اپنے اُن پڑھ ہونے پر فخر کرتے گاؤں میں کیسے بیاہی گئی تھی۔ اُس میں کوئی نقص تو نہ تھا، شکل وجہ بھی تیکھی اور سوتیلی  
قد بُت بھی ایسا تھا کہ جب سر پر انو جھا کر اُس پر لسی سے لبریز چائی دھر کر اس پر دسترخوان میں بندھی توری روٹیاں اور  
کے پیڑے رکھ کر اُختی تو صحن کی چوکھٹ کے پار اس لیے نہ ہو سکتی تھی کہ چائی پر دسترخوان میں بندھی روٹیاں چوکھٹ سے  
کر گر جاتیں۔ تب وہ چائی سر پر سے اتار کر پہلے خود چوکھٹ کے پار ہوتی اور پھر چائی اٹھا کر کنویں کی جانب روٹ  
جاتی۔ اس کی قامت کا یہ حساب تھا۔

محکم دین کی زمین جتنی تھی وہ بمشکل گزارے والی تھی۔ اور وہ بھی اپنی برادری کی طرح پٹا اُن پڑھ  
تو پھر گولیسی کے ایک پڑھے لکھے خاندان سے اپنی بیٹی کو ایسے اچھا کاؤل میں ایک ان پڑھ کسان کے ساتھ کیوں بیاہ  
رابعہ بی بی کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ وہ انیس برس کی ہو گئی تھی۔ اور اُس کے ماں باپ نے اگر اس کا رشتہ کرنا تھا تو  
جانوں میں اور پڑھے لکھے جانوں میں کرنا تھا اور انہیں برادری میں دور دور تک کوئی پڑھا لکھا نظر نہ آتا تھا اور  
رابعہ نے بیسویں سے بیسویں برس میں قدم رکھ دیا تو وہ گویا اُن کے نزدیک بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ گئی۔ اُس کے ماں  
نے اپنی بیٹی کو اچھا لکھا ہوا ایک چاروں طرف سے لکھا ہوا لٹریچر کے عالم نے ہر اس  
محکم دین کو قبول کر لیا۔ اُس کی چند ٹیکے زمین، ایک پسار دودھ کوٹھڑیوں اور کچے صحن میں سایہ کرتی بھری کے ایک درخت  
قبول کر لیا۔ جب رابعہ بی بی نے ڈولی سے باہر پہلا قدم اُس کچے صحن میں رکھا تو ایک گنوا لاکھ خشیت جاٹ کی گھر  
جانے کی دہشت موت سے بھی بڑھ کر تھی۔ پراگلے دو چار دنوں میں ہی اُسے اندلہ ہو گیا کہ محکم دین میں ایک ایسی قد  
دانائی اور درویشی تھی جو اُسے پڑھے لکھے کسی ممتاز خاندان کی بیوی پر راضا دیتے مزاج کا ایک ایسا شخص ظاہر ہوا  
کے ہونٹوں پر مرتے دم تک نہ صرف اُس کے لیے بلکہ گاؤں کی کل مخلوق کے لیے ایک بھی حرف شکایت نہ آیا۔ رابعہ  
اس کی چاہت میں یوں جلتا ہو گئی کہ یکدم اسے بول سا اٹھتا اور وہ چادر سر پر ڈال کر اس کھیت کی جانب چل پڑتی جہاں  
دین بُل چلانے کی مشقت میں بٹتا ہوتا۔ دور سے اُسے ایک نظر دیکھتی اور گھر لوٹ جاتی۔

اُس پر قیامت اُن دنوں میں ٹوٹ پڑتی جب جاٹ برادری کے لوگ چند ہفتوں کے لیے اپنے ڈھگر  
جنگل نیلے میں جاگیرا کرتے۔ اُس کا کلیجہ اُس کی جدائی میں کٹنا رہتا پر وہ گاؤں کی دیگر عورتوں کی مانند اپنے مرد کے  
وہاں جا آباد ہونے سے گریز کرتی کہ وہ دوسرے مردوں کے سامنے یوں ظاہر نہ ہو سکتی تھی۔ یہ اُس کی خاندانی مجبوری تھی  
لگاتار تین بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والا امیر بخش رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ دس کوس کے فاصلے پر واقع پراگری سکول جاٹ  
سے پیشتر اُسے چناب کے پار اپنے چاہے کا ناشتہ پہنچانا ہوتا تھا۔

امیر بخش کی قامت اپنی ماں پر گئی تھی۔ محکم دین کا قد درمیانہ تھا پر وہ ابھی سے یوں سر بلند ہوتا جا رہا تھا کہ  
سے ایک دس برس کا بچہ نہیں ایک چھریرے بدن کا نوجوان لگتا تھا۔

اس کی خصلت اپنے باپ پر گئی تھی۔

حیاتِ ان دونوں تو کیسا سنگھم شانت.. خوابیدہ.. و صبح سے بہتا تھا، پانیوں پر ایک کروٹ بھی نہ ابھرتی تھی پر ایک ایک آتی تھی، سیلاب آ جاتا تھا تو اُس کے پانی اتھرے اور بے دید ہو جاتے تھے۔ منہ زور گھوڑیوں کی مانند کناروں سے گزرتے ہوئے ہو جاتے تھے۔ چار پھیرے کے سب گاؤں، کھیت کھلیاں، کنویں، جوہڑ اور کچے راستے پانی سے برابر ہو جاتے تھے۔ پانی اتنی سرعت اور خاموشی سے آتے تھے کہ ڈیریوں پر سوئے ہوئے کسانوں کی چار پائیاں بہا کر لے جاتے تھے۔ یہاں پر ہو کر اپنے تئیں پاؤں زمین پر رکھتے تو وہ پانی میں جا پڑتے اور وہ بھی کسی اور گاؤں میں۔ ابھی دو برس پیشتر ایک ایک کے پانی اُترے۔ زمین سوکھنے لگی تو امیر بخش گاؤں پر براجمان بیلوں کو بانگتا تھا اور ماہل پر آویزاں ٹنڈیں.. کچے کھیتوں میں سے ابھرتے پانی سے تھمکتے باہر آتے تھے اور اولو کو لہریز کرتے تھے جب اُسے نیچے سے کچھ گدگدی ملتی تھی جیسے ایک بگی سرسراہٹ ہو۔ اُس نے بیلوں کو روکا، گاؤں سے اُتر کر اُس کے بان کے تانے بانے کو ٹولا تو اس میں سے چھوٹے چھوٹے سانپ بیلے میں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ہلکے دھڑکنے لگے۔ وہ چناب کے پانیوں میں بے بسی سے تھکے آئے تھے اور اس گاؤں سے ٹکرا کر جان بچانے کی خاطر اس کے بان کی ہٹ میں سرکے روپوش ہو گئے تھے۔ جانوں کا کوئی اور لڑکا ہوتا تو وہ فوری طور پر انہیں اپنی جوتی سے چل دیتا پر امیر بخش جسے کچھ کھیر وٹوں اور جنگل سے ملنے والے جانوروں سے عجیب سا انس تھا.. وہ انہیں ہلاک کر دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا.. وہ انہیں گھاس میں سے اُٹھانے اور چھایک کنویں کے آس پاس جو بھار پان میں اُن میں روپوش ہو گئے.. اُن میں سے ایک نادانی سا سپہلیا تھا جسے کھانسی نے وہ کدھر کو ٹھکے.. امیر بخش نے اُس کی جانب ایک سوکھی مٹی بڑھائی کہ وہ بے جا مٹی کے خوف میں نہ پھنس جائے۔ وہ اُس سے پلٹ گیا اور امیر بخش نے اُسے کنوئیر سے چھوٹے چھوٹے جاکر دھان کے ایک کھیت میں چھوڑ دیا۔

اُس کی آئندہ حیات بھی اسی خصلت کے تابع رہی.. بہت سے انسان اُس کی جان کے آزار کو آئے، اُس کے ہاتھ پیرے رہے.. اُسے ایذا دینے اور حیات کو مشکل بنانے کے درپے رہے.. اُس کی زندگی کی گاڑی میں سے سانپوں کی طرح مچھلیوں کی مانند گرتے رہے پر اُس نے اپنی خصلت کے تابع انہیں بھی بخش دیا.. اُن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

وہ آخری منجھی بھر ہاؤلا پرندہ بھی جب سفید زون کی دُھندلی دنیا میں سے ظاہر ہو کر اُس کے سر پر سے اُڑاں اٹھانے کی جانب نکل گیا تو اُس نے اپنا تہبند اُتار لہسی کی چاٹی اور روٹیوں کا دسترخوان اپنے سر پر توازن کیا اور پانیوں میں تھک کر بیٹھا۔

کناروں کی قربت میں جو پانی تھے، گہرے نہ تھے.. بمشکل اُس کی رانوں تک آتے تھے.. البتہ اُن کی رخ بستی کے پیرے بدن میں سرامت کرتی تھی۔

چناب ایک ہموار افق تا افق آبی وحدت نہ تھا.. اُس کے درمیان میں کہیں ریتلے ٹاپو آ جاتے تھے اور کہیں

ریت کی گیلی دلدل.. وہ مختلف حصوں میں بنا ہوا تھا۔ چنانچہ امیر بخش پانیوں میں تیرتا کم تھا اور اُن میں چلتا زیادہ تھا۔ ریت کے ٹاپو عبور کر کے وہ اُن کے پار چناب کی ایک اور شاخ میں اترتا اور پھر تیرنے لگتا۔

اور جہاں اُس کے اور جنگل نیلے کے درمیان میں چناب کی ایک اور ندی پڑتی تھی تو اُس کے پانی ذرا گہرے تھے رقتار اور ڈوبتے تھے.. وہ یہاں پہنچ کر ڈرامہ لیتا.. اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی کسان اپنے ڈھور ڈھر سمیت پار جانے کے لیے پانیوں میں اتر رہا ہوتا تو وہ کوشش کرتا کہ کسی گائے کی دم پکڑ کر اُس کے ہمراہ.. اُس کے سہارے پار چلا جائے..

گائے کا انتخاب اس لیے موزوں اور محفوظ تھا کہ وہ پانیوں میں تیرتی ہوئی ڈبکی نہیں لگ جاتی جب کہ بھینس کچھ اعتبار نہ تھا.. وہ یکدم اپنے بھاری وجود کے ساتھ پانی میں غرق ہو کر زیر آب تیرنے لگتی تھی..

ایک ڈگر کی دم اگر مضبوطی سے گرفت میں لے لی جائے تو آپ اُس کے سہارے تیز ترین دریا میں بھی آسانی سے بہتے جاسکتے ہیں.. پر ہر کوئی اس پر قادر نہ ہو سکتا تھا.. مخروطی دم پر اکثر مٹی جمی ہوتی ہے اور وہ گیلی ہوتی ہے اُس پر مسلسل گرفت رکھنا مشکل ہوتا ہے اور تیرتے ہوئے بھینس کی سرخسی سے کچھ بچنے پر ہے اور کب بغیر اعلان کیے ڈبکی لگا جائے تو اس کا حساب کتاب بھی لگانا پڑتا ہے.. ذہنی طور پر یکدم ڈوب جانے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے.. ہر برس ایک نوجوان کسی گائے یا بھینس کی دم پکڑ کر دریا کے پار جاتے ہوئے ڈوب جاتے تھے..

پانچویں دس برس کا امیر بخش اس مشترکہ بیراکی کا ماہر ہو چکا تھا.. ویسے بھی امیر بخش کو کچھ فطرت نہ پڑتا تھا کہ گائے کی دم پکڑ کر ڈوب جائے.. وہ صرف دیر پانیوں کا اندازہ لگاتا تھا.. جب کوئی اُس کی آواز بھینس یکدم دریا کے نیچے ڈبکی لگا جاتی اور وہ بھی اُس کی دم تھا تو پانیوں کی دنیا میں ڈوب جاتا تو اسے وہاں زیر آب ایسی مخلوق دکھائی دیتی جو نہ کسی نے سنی اور نہ کسی نے دیکھی.. مچھلیاں.. کھوے.. سانپ.. لڈھو.. عجیب رنگوں اور شکلوں کے.. کم از کم دو بار اُس نے بھینسوں سے بھی بڑے سنسار دیکھے.. مگر کچھ دیکھے.. اور ان مگرچوں کے جڑے بھی حیرت سے کھل گئے کہ اُن کی آبی دنیا میں ایک ایسی مخلوق کی طرح چلتا ہے اور وہ اسے کچھ نہ کہتے.. اپنے آپ پر چڑھ کر لیتے..

آخری بہاؤ کو عبور کر کے جب وہ جنگلی نیلے کی گھناوت میں نچرنا ہوا قدم رکھتا تو سامنے پانیوں کی بے رنگی کے بعد اتنی ہریاں ہوتی کہ اُس کی نیلی آنکھیں بھی ہری ہو جاتیں.. وہاں آسمان کو چھوتے پتوں سے تاریک ہوتے دکھاتے اُن کے تنوں سے لپٹی بلیں تھیں اور اُن کی شاخوں میں شاید اُن پرندوں کے گھونسلے تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے دھند میں چھپے تھے اور زمین کمر تک آتی گھاس اور گھسی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور وہ جہاں بھی قدم رکھتا وہاں سے کوئی نہ کوئی تے بھدک کر باہر آ جاتی اور غائب ہو جاتی..

ایک بار اُس نے ہرنوں کی ایک ڈاکو نہایت سادہ حالت میں دیکھا تھا اور اُن سب کی مدد بھری نشیانی آنکھیں اُس پر لگی تھیں..

ہریاں کے اندر.. جنگلی نیلے کی گھناوت میں پوشیدہ وہ ڈیرا تھا جہاں اُس کا چاچا انتظار کرتا تھا..

اُس ڈیرے پر دھوپ بہت دیر میں اُترتی تھی.. وہ بہت مدت تک بلند درختوں کی شاخوں پر لگی رہتی اور بھٹکتا



کے تھے پین کو پار کر کے زمین تک آتی تھی۔ امیر بخش جب اُس گھناؤٹ کے اندر پہنچا تو وہاں ابھی تک نیم تاریکی کا راج  
حکومتی تھی۔

”تمہاری بے بسی ہے بھڑ۔“ اُس کے چاچے نے قدرے شرماتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے چائی کا ڈھکن اٹھا کر کہا: ”چاچا ذرا جھانک لو۔۔۔ لسی کی سطح پر تازہ مکھن کا جو بیڑا تیرتا ہے، وہ بے بے  
تھوڑے لیے رکھا تھا۔ اور اُس پر اُس کی انگلیاں نقش ہیں۔“

مگھم کی چار روٹیاں جس آنے سے گوندھی گئی تھیں، اُس کا ایک ایک ذرہ خوب پکا ہوا اور نیم سرخ رنگت کا  
تھوڑا سا تازہ تھیں، کچھیلی شبِ تنوری میں لگی تھیں۔ رابعہ بی بی اُس تنوری میں جھانکتی، جھانکنے سے پہلے اپنے بال  
سجھاتی تاکہ وہ تہ میں سلگتی آگ میں پکتے شعلوں کی زد میں نہ آ جائیں پر اُس کا جھکا ہوا چہرہ اُن کی زد میں آ کر یوں تھمتاتا  
تھیں۔ کچھ سستے لگے گا۔ وہ چار روٹیاں وہ ذرا دیر تک تنوری میں رہنے دیتی تاکہ اُن کی رنگت نیم سرخ ہو کر محکم دین کی  
جگہ ہو جائے۔ صبح سویرے صرف اُس کی ہاں روٹی ہوا مکھن کے ساتھ کھانے کا شوقین تھا۔

ہر روٹی پر واضح طور پر رابعہ بی بی کی مخروطی انگلیوں کے نشان دکھائی دے رہے تھے، یہ نہیں کہ وہ کچھ تھی، روٹی  
تھیں جانتی تھی۔ یہ پیار کے سندیسے تھے جو وہ جان بوجھ کر ہر روٹی پر ثبت کرتی تھی۔

مگھم دین نے پوری زندگی صرف اس روٹی سے لقمہ لیا جس پر اُس کی گھر والی کی انگلیوں کے نشان کبے ہوتے  
تھے۔ شادی کے بعد بھی اُس نے اُن سے لقمہ لیا۔ اُس کے گھر والی کی انگلیوں کے نشان اُس کے چہرے  
پر لکھ دیے تھے تو اُس کی بھوک جاتی رہتی۔  
بیان کو خلیں کا ایک خاموش ربط تھا۔

امیر بخش انہی قدم پر چناب کے پار سے واپس گاؤں آتا۔ اُوہ رڑھکے ڈھلے ڈھلے دو پیالے پی کر اپنی تختی  
پر دست سنبھال اور دس کوس کی مسافت پر چھوٹے قصبہ دیوانہ کو جان بوجھ کر گتہ چلنے کے پرانے سکول میں وہ چوتھی جماعت  
کا طالب علم تھا اور وہاں مسلمان طالب علم تھا، باقی سب کے سب ہندو اور سکھ لڑکے تھے۔

کوٹ ستارہ کے جتنے بھی مکین تھے وہ صدیوں سے وہیں رہتے آئے تھے اور صدیوں سے کوئی ایک خاندان بھی  
نہیں تھا جو ہر سے آکر یہاں آباد ہوا ہو سوائے اُن کے جو ناگنی ورثہ یا فضیال کی زمینوں کے وارث ہو کر اپنا آبائی گاؤں  
بھگت کر رہا تھا۔ کوٹ ستارہ واضح طور پر دو حصوں میں بنا ہوا تھا۔

امیر بخش اپنی تختی اور بست سنبھال جب اپنے گھر سے باہر گئی میں قدم رکھتا تو ذرا دیکھ بھال کر رکھتا تھا کہ گلی کے  
دو طرف ایک بڑی گندی نالی بہتی تھی جس پر ناگنیں پھیلانے کوئی نہ کوئی بچہ فارغ ہونے کے لیے زور لگا رہا ہوتا۔ اُس کے  
گھر کے باہر میں مولوی نور دین کا گھر تھا اور اُن کی دیواریں سانجھی تھیں اور ان دیواروں کے ساتھ ماچھیوں کے کوٹھے  
تھے۔ ان ماچھیوں کی مالی حالت قدرے بہتر تھی کہ وہ اپنی دو کشتیوں پر لوگوں کو چناب کے پار شہر رسول نگر تک  
لے جاتے تھے جہاں سے وہ فرین کے ذریعے گوجرانوالہ تک سفر کر سکتے تھے۔ وہ جانوں کے گھروں میں پانی لے کر جاتے  
تھے۔ ان کے گھر سے بھرتے تھے۔ بائیں جانب گہاروں، جولاہوں، ترکھانوں، ٹائیوں اور لوہاروں وغیرہ کے کچے

گھروندے تھے اور گلی کے آخر میں میراثیوں کے دو گھر تھے جن کی شناخت آسانی سے ہو جاتی تھی کہ جب سارے چاند منہ اندھیرے بیدار ہو کر کھیتوں کی جانب نکل جاتے اور باقی لوگ اپنے اپنے پیشوں میں مصروف ہو جاتے تو یہ صحنہ میراثی تھے جو دن چڑھے تک اتری ہوئی تیز دھوپ میں کوشوں پر سوتے رہتے۔ اور جب تک شدید گرمی اور دھوپ ان کا جڑ نہ کر دیتی وہ نیند میں مدھوش رہتے۔

یہاں جانوں اور ان کے معاون پیشہ لوگوں کے گھروندوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ اُن سے پرے ایک وسیع جوہر جس کے دوسری جانب ایک اور گاؤں شروع ہو جاتا جو جانوں کے کوٹ ستارہ سے سراسر مختلف شکل کا تھا۔ جانوں کے گھر تو کچے اور زمین سے جڑے ہوئے دور سے زمین ہی لگتے تھے جب کہ جوہر کے پار پکی لکڑی کے چوبارے اور مٹیاں زمین سے بلند ہو کر نمایاں نظر آتے تھے۔

وہاں جتنی گلیاں تھیں سرخ اینٹوں کی پکی گلیاں تھیں اور اُن کے درمیان جونالیاں تھیں، وہ بھی ڈھکی ہوئی تھیں۔ جب کوٹ ستارہ پر رات کے اندھیروں کا راج ہو جاتا تو جانوں کے محلوں میں کوئی ایک آدھ دیا ٹمٹما کر اُن کی گلیوں میں کسی جلنے والے کا ہر دوسرا قدم کچڑ اور گندگی میں دھنستا تو آدھرا اُس دو طرفے کوٹ ستارہ کی گلیاں مٹی کے جلنے والے پلوں سے روشن ہوتیں۔

میں پر اُس کا چاچا رام واس رہتا تھا جس کے بھی کھاتوں میں نہ صرف اُس کے پاس کی بلکہ بیشتر مسلمان جانوں کی جانیں کا سلسلہ تھا کرتی۔ میں تکیہ کی گلی میں اور ان کے محلوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ بعد دو گنا ہو جاتا کتنا رہ گیا ہے۔

یہ عجیبی طور پر ہندوؤں کے محلے تھے۔ اُن میں کچھ شاہوکار تھے۔ لیکن بیشتر اجناس کا کاروبار کرتے تھے۔ رسول نگر اور گوبرنوالا کے محلے آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک محلہ سکھ جانوں کا بھی تھا جو ہندوؤں جتنے مشمول تو نہ تھے مسلمانوں سے قدرے بہتر معاشی حالات میں تھے۔ وہاں کاروبار ہندوؤں کی نسبت مسلمان جانوں سے زیادہ تھا کیونکہ ایک ہی ذات کے تھے۔ وہ اُن کی ہر خوشی غمی میں شریک ہوجاتے۔ یعنی کی ڈولی کو کاٹ دھادیتے۔ دھواڑیں مار مار کر روتے اور بیٹے کی شادی ہوتی تو وہ دوہے کی گھوڑی کے آگے وارو میں ڈھت پگڑیاں کھول کر نچھلے ہاتھ، بال بکھراتے بھنگڑے ڈالتے۔ وہ اپنا ہار پتی ساتھ لے کر جاتے کہ اُن کے سوکھے راشن کا اہتمام الگ سے جاتا اور وہ اپنا کھانا جس میں جھکے کا گوشت انہیں مرغوب تھا، الگ سے پکواتے۔ اور ان میں چاچا ہر نام سنگھ اور اُس کا سوہن سنگھ بھی شامل ہوتے۔ سوہن سنگھ اور امیر بخش کی یاریاں گوزھیاں تھیں۔ وہ تب سے بیٹی تھے جب وہ دونوں گھڑنگ جوہروں میں ڈبکیاں لگاتے، بیٹے میں خرگوشوں کا پیچھا کرتے کرتے اُس کی گھناوت میں راستہ کھو بیٹھتے تھے۔ پینہ کر دینے لگتے تھے۔

تو ایک ہی گاؤں میں ایک ایک جانب کوئی ایک آدھ دیا ٹمٹماتا ہے۔ تارکی میں ذُفن ہے اور اُس گاؤں کے ایک حصے میں گلیاں روشن ہیں۔ مٹی کے تیل کے لیپ روشن ہوتے ہیں اور گھر چوبارے کی اینٹوں کے بنے ہیں۔ سرشام جب اُن کی گلیوں میں تاریکی راج کرتی ہے تو وہاں موٹی موٹی ہندو عورتیں اپنی روشن گلیوں میں

تھکتی ہیں اور ان کے پاؤں تلے کسی نالی کی گندی غلاظت نہیں آتی۔  
امیر بخش کو اس زمین آسمان کے فرق کی سمجھ نہ آتی تھی۔

ان گلیوں اور چوہاروں کے اوپر کوٹ ستارہ کے آسمان پر کچھ برج مینار بلند ہوتے نظر آتے جو گوردوارہ نانک  
نہال صاحب کے تھے۔ پوری تحصیل میں اتنی لوبلیگی اور سوہنی عمارت اور کوئی نہ تھی، سکھوں کے علاوہ ہندوؤں کی بارائیں  
میں بھی ان کے مہن میں اترتی تھیں جس کے درمیان میں ایک چوڑے گھیر والا قدیم کنواں تھا جس کی ماہل سے لپٹ کر سکھ  
بچے اس کی تہہ میں اتر جاتے تھے اور پانیوں میں ڈبکیاں لگاتے تھے۔ امیر بخش صرف ایک بار بیساکھی کے تہوار پر چاچے  
کرائے سکھ کے پوتے کھڑک سنگھ کے ہمراہ اس گوردوارے کے اندر گیا تھا۔ اور اس کی شان و شوکت اور آرائش سے بے حد  
عجب ہوا تھا اور وہ اس چوڑے گھیر والے قدیم کنویں کی ماہل سے لپٹ کر اس کے اندر اترنے والے سکھ بچوں کو دیکھ کر  
تھکیں اس میں اتر جانے کی خواہش میں مبتلا ہوا تھا۔ پر جب وہ ذرا آگے ہوا اس خواہش کی تکمیل کی خاطر تو کھڑک سنگھ نے  
اس کا بازو تھام لیا۔ ”نہیں امیر بخش، یہ عزم کا معاملہ ہے، پانیوں کو کھوش نہ کر۔“

کبھی نہ کبھی یہ نظریہ بالکل بور ہوا تھا کہ جانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ صرف جاث ہوتے ہیں۔  
اب اس سچی سکھ کا معاملہ خد تھا، وہ تو ایک ہی بیالے میں سے باری باری لسی سُکر لے لیے تھے اور کچھ بھی بھر شٹ

UrduPhoto.com

وہاں جہاں ہم ہیں اتنی غلاظت اور بھوک اور تیرگی کیوں ہے اور یہاں جہاں یہ ہیں ان گلیوں میں روشنی چیم چیم  
کس سے ملتی ہے۔

اسے سکول جاتے دیکھ کر بڑا دلچسپ لگتا تھا۔ وہاں بچے پڑھتے، لکھتے، کھڑے۔۔۔ طنز یہ اور پُر تکبر آواز سے کہتے۔۔۔ یہ  
جسٹن تھم دین کا بیٹا ہے ناں۔۔۔ خیر سے پڑھنے جا رہا ہے۔۔۔ محکم دین سنا ہے کہ اپنی زمین بچ بچ کر اسے پڑھا رہا ہے۔۔۔  
کچھ بچہ حاکم یہ ایک بٹی کر لے گا ناں۔۔۔ لالوں کی مانند خیر سے حساب کتاب کرے گا، جانوں کا لڑکا۔ اور وہ ہنس ہنس کر  
بھاگ جاتا ہے۔

وہ ایک دھبی دل سے آزرہ اپنی ماں سے جب یہ حال بیان کرتا تو اس کی راجد بی بی کی آنکھوں میں ایک غصیلی  
تھکتی تھی۔ ”چڑیے گنوار لوگ ہیں، تو ان جیسا نہیں ہے، تیرے ماموں پڑھے لکھے ہیں۔ تو نے ان جیسا ہونا ہے۔ تم  
کچھ سمجھتے ہو ناں کہ تمہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہماری گلیاں تاریک کیوں ہیں اور ان میں کچھ بھری نالیاں کیوں ہیں  
جس سے روشنی کیوں اتنی روشن ہے تو بیٹے صرف اس لیے کہ وہ تعلیم سے روشن ہیں۔ وہ پڑھنے لکھنے کو عار نہیں سمجھتے۔ تو نے اس  
کو سمجھا ہے۔ ان جیسا ہو کر اپنی تاریک گلیوں کو روشن کرنا ہے۔“

وہ آسانی سے ہیلاں کے پرائمری سکول سے پوری چار جماعتیں پاس کر گیا۔ یہاں تک چار جماعتوں تک تو  
کچھ کچھ سکھ ہوا تھا لیکن اس کے آگے کی تعلیمی مسافت کے سامنے متعدد دھمالے کھڑے تھے۔ ہائی سکول مکھو وال وہاں



سے بیس کوس کے فاصلے پر تھا اور وہاں ایک ہی دن میں آنا جانا کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ زمین کا ایک اور ٹکڑا فروخت ہو گیا۔ اس رقم سے نئی کتابوں اور نفیس کا بندوبست ہوا اور سکول کے ہوٹل کے ایک کمرے کا جس میں چار طالب علم رہ سکتے تھے کرایہ ادا کیا گیا۔

یہ ایک نئی اور امیر بخش کے لیے ایک بین الاقوامی دنیا تھی جہاں بھانت بھانت کے لوگ اور بولیاں تھیں۔ اس پاس کے درجنوں دیہات کے طالب علم تھے جن کے لہجے اس کی پنجابی سے اتنے مختلف تھے کہ انہیں سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ مگھو وال کے مڈل سکول میں البتہ چار مسلمان لڑکے بھی تھے پر وہ ان کے قریب آنے میں ناکام رہے کیونکہ ان کے نزدیک وہ نہ صرف ایک پسماندہ گاؤں سے آیا تھا بلکہ ایک اجڑ جات بھی تھا جس کے لہجے کا وہ مذاق اڑاتے۔ ان میں سے دو سید ذات کے تھے جن کے باپ نامعلوم سے بزرگان دین کی قبروں کے مجاور تھے، ایک کسی مولوی کا بیٹا تھا اور چوتھے کا تعلق کسی مخدوشی ذات سے تھا۔ چنانچہ اس کی دوستی صرف سکھ جات لڑکوں تک ہی محدود رہی جو اس کے لیے گھما دل رکھتے تھے۔

یہاں آکر اس پر حلا کہ یہ ہندو اور سکھ تعلیم کے میدان میں ان سے برتری رکھتا تھا۔ وہ پڑھائی میں اتنی مشقت کرتے تھے کہ کل چلانا یا سہاگہ پھیرنا اس کی نسبت کہیں آسان تھا۔ اس کا ایک روم میٹ سامنے چالوں کے براہمنوں کا پڑا کاشی رام تھا اور جیسے موٹھوں کو تاؤ دیتے ہیں، وہ ایسے اپنے منہ سر کے درمیان میں لٹکتی پالوں کی ایک پٹیا کو تاؤ دیتا رہتا تھا۔ اس کا بیٹا بھی ایک بڑا بڑا لڑکا تھا جس کے والدین نے اس کے لیے ایک بڑا مکان بنوایا تھا جس کے کچھ کمرے اپنے گھر کے عین درمیان میں گوند سے چپکایا ہوا ہے۔ یہ وہ اس بڑا من زادے سے قدرے خائف تھا کہ جائے اسے کیسے کیسے جھڑپ منتر آتے ہیں۔ اس پر چوک دے۔

کاشی رام ان کا گھر والوں کے دنوں میں نہایت اہتمام سے کمرے کی چھت کے ایک شہتر سے ایک رشتی باندھتا تھا۔ پھر راتوں کو عین اس کے نیچے آلتی پالتی کو بوند بوند پین پینا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کمرے کے سر بلا کر اطمینان کر لیتا کہ وہ کھل تو نہیں جائے گی اور پھر پڑھائی میں مگھو جاتا، ذرا سی اونگھ آتی، ہر ڈھلکنے لگتا، پٹیا کے بال کھینچ کر اٹھرنے کو ہوتے تو وہ اس اذیت کو برداشت کرتے ہوئے ایک دم ”رام رام“ پکارتا اور پھر سنبھل کر سیدھا ہو کر یوں کہ وہ رشتی اور اس کی بودی پھر سے تھک جاتے، پڑھائی میں مگھو ہو جاتا۔

ان ہندوؤں کی پٹیا جواب تک اس کے لیے تلفظ ضعیف کا باعث رہی تھی، اس کے لیے قابل احترام اس لیے ہوئی کہ وہ پڑھائی کی مشقت کے لیے کہیں معاون ثابت ہوتی تھی۔

اگرچہ دیگر جانوں کی مانند اس نے بھی ”چھتے“ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بال تقریباً کاٹھوں تک آتے تھے پر انہیں ایک رشتی کے ساتھ باندھنا ممکن نہ تھا۔ اس دوران فادہ قصبے کے مڈل سکول کے ہوٹل میں ایک عجیب ڈراؤنی رات آئی۔ تب وہ ساتویں جماعت میں تھا۔

وہ چاروں گھوک سوئے ہوئے تھے جب رات کے چھپتے پہر ان کے کانوں میں ایک عجیب سی ٹھنوں ٹھنوں اور پڑھو گھاؤ گھاؤ کی آواز اتری جیسے کوئی بلا ہو جو چٹھھاڑ رہی ہو اور وہ اس ہیبت ناک آواز سے واقف نہ تھے۔ کاشی

حقیقت یہ ہے کہ وہ ہرگز چھت سے بھولنے والی رسی کو قہام لیا اور کوئی جہنم منتر بڑبڑانے لگا۔ دوسرا لڑکا جو ذرا کم ذات کا تھا، کاشی رام کے پاؤں سے لپٹ گیا اور تیسرا جو کہ ایک سکھ تھا، اپنے آپ پر جبر کیے بیٹھا رہا اور جب وہ چنگھاڑتی ہوئی آتی تو آوازیں مسلسل آتی رہیں اور وہ چاروں ان سے دہشت زدہ ہوتے جھک آگئے تو انہوں نے اپنے کمرے کی دھڑکی کے پٹ کھولے اور اُس میں آویزاں سلاخوں کو قہام کر خوشنودہ بندروں کی مانند باہر گلی میں جھانکنے لگے اور وہاں ایک کچی سیاہ مفریتیں تھیں جو ٹکھوں ٹکھوں کرتی چنگھاڑتی تھیں اور اُن کے ماتھوں پر جو آنکھیں تھیں اُن میں سے آنکھوں کی جڑیں دینے والی تیز روشنی کے انگارے برستے تھے۔

وہ مفریتیں کبھی رُکی تھیں تو زیادہ چنگھاڑتی تھیں۔

یہ ٹکھوں ٹکھوں اور چنگھاڑ مچ تک جاری رہی۔ جونہی روشنی ہوئی امن ہو گیا۔ اُس سو پر ڈرتے ڈرتے وہ باہر گلی میں آئے تو کچھ پر اُن باؤں کے گزرنے کے نشان تھے۔

اُس روز اُن کے حساب کے ماسٹر کوڑ پائی گئے۔ انہیں بتایا کہ چلی دات ملکھو وال میں سے انگریز سرکار کی فوج گذری تھی جو نرکوں اور پٹیل میں سوار تھی۔ حالیہ بارشوں کی وجہ سے ہر جگہ جو کچھ ہو رہا تھا اُس میں وہ نرک اور پٹیل میں بھی جاتی تھیں اور اُس میں سے نکلنے کی کوشش میں وہ اتنا ٹکھوں ٹکھوں کرتی تھیں اور چنگھاڑتی تھیں۔

انگریز سرکار کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔

UrduPhoto.com

یہ سرکار آتی رہی۔ آج کل کا جانا جاتا ہے کہ یہ سرکار اپنے پٹیلوں کو بھالیہ بناتی کر کے بھالیاں کے قصبہ کو ایک یونانی نام عطا کر کے چلا گیا۔ سب آتے جاتے تھے اور چلے جاتے تھے پر وہ جاتے جاتے۔

جو بھی اہدائی، غریب، غوری، مغل آتے تھے اُن کی کھیتیاں برباد کر کے اُن کی گورتوں کو اٹھا کر چلے جاتے

تو نریت سنگھ کے بعد اگر یہ انگریز سرکار چلی آئی تھی جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہ جانتے تھے کہ اس کا ناک کا نام ہے۔ کبھی ڈسٹنڈ یا پٹنی تھی کہ ڈپٹی کمشنر بہادر آ رہے ہیں تو رعایا اُن کے دیدار کرنے کے لیے اُمدی پڑتی تھی۔ اور وہ صاحب کی آگے گورے گورے ہوتے تھے کہ جاٹ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے کہ یہ صاحب اتنا سفید کیوں ہے تو کوئی یہ کہتا تھا کہ اسے شنید ہے گورے صاحب صاحب کو پورے پچاس روپے تنخواہ ملتی ہے تو وہ اس تنخواہ سے گرو خریدتا ہوگا اور اسے رات کھاتا ہوگا اس لیے اس کا رنگ اتنا سفید ہو گیا ہے۔

پر ان ڈپٹی کمشنروں صاحب بہادروں کے قافلے بڑی سڑک کے آس پاس کے گاؤں میں ہی پڑاؤ کرتے تھے۔ دھڑک دھڑک اور جانگی علاقوں میں نہ آتے تھے۔ تو وہ اس انگریز سرکار کے ناک نقشے سے واقف نہ تھے۔ ماسٹر گور بچن سنگھ نے انہیں ڈرامہ گوشی میں یہ بھی بتایا کہ امرتسر کے شہر میں کسی جلیاں والا باغ میں گولی چلی ہے۔ کسی ڈاکٹر صاحب بہادر کے محلے سے پانچ چھ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کو مار ڈالا گیا ہے۔ لاشوں سے کنویں بھر گئے ہیں۔ تو انگریز سرکار کو خدشہ ہے کہ کبھی بغاوت نہ ہو جائے۔ بدامنی نہ پھیل جائے اس لیے اپنی سلطنت کے پتے پتے میں فوج بھیج دی ہے یہاں تک